بین الاقوامی صورتحال
تجزیہ اور پیش منظر
2016ء

مجوزہ دستاویز نمبر 3

35 ویں کانگریس 2016ء

فہرست

۱۔معاشی بحران کا تجزیہ وپیش منظر

۲۔چین

۳۔ہندوستان

۴۔افغانستان

۵۔ایران

۶۔عرب انقلاب اور مشرق وسطیٰ

۷۔یورپ

۸۔روس

۹۔ریاست ہائے متحدہ امریکہ

۱۰۔کینیڈا

۱۱۔لاطینی امریکہ

۱۲۔آسٹریلیا

معاشی بحران کا تجزیہ و پیش منظر

2008ء کے مالیاتی کریش کو آٹھ سال بیت چکے ہیں اور یہاں سے شروع ہونے والا معاشی بحران عالمی سرمایہ دارانہ معیشت پر تاحال ایک آسیب کی طرح منڈلا رہا ہے۔ مختلف ممالک بشمول امریکہ میں بحالی (Recovery) کے تمام تر سرکاری دعووں کے باوجود معیشت کی صورتحال انتہائی نازک ہے اور بحالی انتہائی کھوکھلی ہے جو محنت کش طبقے اور نوجوانوں کے سماجی اور معاشی حالات میں کوئی بہتری لانے سے قاصر ہے۔ الٹا حالات زندگی میں مسلسل ابتری اور کٹوتیاں (آسٹیریٹی) ہی 2008ء کے بعد کا معمول ہیں۔ عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ معیشت ایک باریک رسی پر لڑکھڑاتے اور ڈولتے ہوئے چل رہی ہے۔ کہیں گہرا بحران، کہیں معیشت کی سست روی، کہیں جزوی لیکن نحیف بحالی اور مجموعی طور پر مسلسل عدم استحکام اور نازک کیفیت، عالمی معیشت کی موجودہ صورتحال کو اسی طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داری کے اپنے معیشت دان 2008ء کے بعد کے عہد کو 'لمبے عرصے تک چلنے والی سست روی' (Secular Stagnation) پر مبنی قرار دے رہے ہیں اور پال کروگمین جیسے نوبل انعام یافتہ بورژوا معیشت دان ایک سے زیادہ بار آنے والے طویل عرصے میں 'مسلسل گراوٹ (Permanent Slump) کا تناظر پیش کر چکے ہیں۔

اس نظام کی ٹوٹ پھوٹ اور تاریخی استرداد کے سماجی اور سیاسی اثرات کہیں بغاوتوں اور انقلابی تحریکوں اور کہیں خونریزی، بربریت اور جنگوں کی شکل میں مسلسل ابھر رہے ہیں۔ عدم استحکام اور انتشار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اصلاح پسندی اور قدامت پرستی کی سیاست یورپ، امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں زوال پزیری کا شکار ہے۔ معاشی توازن کے ٹوٹ جانے سے سیاسی اور سماجی توازن بھی بگڑ گیا ہے۔ ایسے میں بائیں اور دائیں بازو کے نئے رجحانات ابھر اور زائل ہو رہے ہیں۔ اس نظام کو 'بہتر' کرنے کی ہر سیاست ناکام ہے۔ جبر کا سب سے بڑا آلہ کار ریاست بھی اس بحران اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس میں پہلے والی جڑت اور پختگی نہیں رہی۔ اس کیفیت میں ریاست کو بڑے پیمانے پر جبر کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کے اپنے ٹوٹ جانے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

شرح منافع کا بحران

سرمایہ داری کے بڑے نامور ماہرین 2008ء کے کریش کی قطعاً پیش گوئی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح وہ ایسے بحرانات کی حقیقی وجوہات کا تعین اور انہیں فوری محرکات سے ممیّز کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ مارکس نے سرمائے کے ارتقا کے تناظر، اس کی عالمگیریت اور اس کے موضوعی بحران کے عمومی خطوط استوار کئے تھے۔ مارکسی پیش منظر کوئی حتمی 'بلیو پرنٹ' یا جوتشیوں والی پیش گوئی نہیں ہوتا بلکہ وہ عوامل کے تغیر کی طرز، ان کے ارتقا سے جنم لینے والے واقعات اور بحرانات اور ان کے نتائج کا ایک خاکہ ہوتا ہے جس میں تخلیق اور ترویج مسلسل جاری رہتی ہے۔

کارل مارکس نے 'سرمایہ' میں لکھا تھا کہ ''عمومی شرح منافع کی گراوٹ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کا ایک مخصوص اظہار ہوتا ہے۔ یہ محنت کی سماجی پیداواریت کی ترقی کے ارتقا کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عارضی طور پر شرح منافع کی گراوٹ کی دوسری وجوہات نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اگر ہم سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کی فطرت کے حوالے سے جائزہ لیں تو ثابت ہوتا ہے کہ اس کے ارتقا میں قدر زائد کی عمومی اوسط شرح منافع کی گراوٹ میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ چونکہ زندہ بار وزگار محنت کی بڑی تعداد اپنی پیدا کردہ مادی محنت (مشینری وٹیکنالوجی) کے مقابلے میں مسلسل تنزلی کا شکار ہوتی ہیں... زندہ محنت کا قدر زائد میں منجمد حصہ مجموعی سرمائے کی قدر کے مقابلے میں لازمی طور پر مسلسل گرتا چلا جاتا ہے۔ چونکہ قدر زائد سے مجموعی لگائے گئے سرمائے کی نسبت ہی شرح منافع بناتی ہے اس لئے یہ شرح گر جاتی ہے''۔ (سرمایہ، جلد 3، باب 13)

لیکن شرح منافع میں گراوٹ کا رجحان سرمایہ دارانہ معیشت کے بحران کی براہ راست وجہ نہیں ہوتی تاہم یہ کئی طرح کے نئے تضادات کو جنم دیتا ہے۔ ذرائع پیداوار میں نئی پیش رفت اور مسلسل پھیلاؤ کے لیے جس سرمایہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے وہ منافعوں سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح حکمران طبقات کے پروردہ طبقات کے ارتقاء کے لئے بھی منافعے درکار ہوتے ہیں۔ قرضوں کی واپسی کا عمل بھی شرح منافع میں گراوٹ کے پیش نظر مشکل ہوتا چلا جاتا ہے اور قرضوں کا حجم بڑھتا جاتا ہے جو ایک نہج پر پہنچ کر بحران کو جنم دیتا ہے۔

شرح منافع کو برقرار رکھنے کے لئے سرمایہ داروں کو قدر زائد میں مسلسل اضافہ کرنا پڑتا ہے جس کے لئے قوت محنت کی قدر کم سے کم کی جاتی ہے (اجرتوں میں کمی)، اوقات کار بڑھائے جاتے ہیں، پیداواری عمل کو تیز کیا جاتا ہے اور جدید مشینری اور ٹیکنالوجی متعارف کروائی جاتی ہے۔ بیکاری بھی معیشت کے زیادہ منافع بخش شعبے سرمایہ داروں کے حوالے کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ ان عوامل سے وقتی طور پر شرح منافع بحال ہو سکتی ہے لیکن سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کے خمیر میں موجود تضاد کو دبایا نہیں جا سکتا اور لمبے عرصوں میں شرح منافع میں گراوٹ کا رجحان برقرار رہتا ہے۔ علاوہ ازیں محنت کے شدید استحصال اور اجرتوں میں مسلسل کٹوتیوں کا عمل منڈی کو سکیڑنے لگتا ہے جس سے زائد پیداوار کے بحران جنم لیتے ہیں۔ یہ عمل گزشتہ کئی دہائیوں سے ہمیں زیادہ شدت اور وضاحت سے نظر آتا ہے۔ پیداواری عمل میں شرح منافع کی گراوٹ کے پیش نظر ہی سرمائے کا رخ سٹے بازی اور مالیاتی سیکٹر میں جوے اور ہیر پھیر کے دوسرے ہتھکنڈوں کی جانب مڑ جاتا ہے۔ سٹے بازی کے یہ بلبلے بڑھتے چلے جاتے ہیں آخر کار 2008ء جیسی کیفیات میں پھٹتے ہیں۔

منڈیوں کے پھیلاؤ اور نئی منڈیاں تلاش کر کے بھی شرح منافع میں اضافے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس طریقہ کار کی بھی حدود ہوتی ہیں اور منڈی اور تجارت کو لامتناہی طور پر پھیلایا نہیں جا سکتا۔ یورپی یونین جیسے ٹریڈ بلاک اور یکجا منڈیاں اسی سلسلے میں بنائی جاتی ہیں جو بحران کے اس دور میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ نوآبادیات یا غریب ممالک میں سستے خام مال اور محنت کا استحصال کر کے شرح منافع میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ گزشتہ کچھ دہائیوں میں منافع خوری کے بحران سے دوچار کارپوریٹ اجارہ داریوں نے چین، برازیل، ہندوستان اور دوسرے ممالک میں صنعتیں منتقل کر کے شرح منافع میں اضافہ کیا لیکن یہ طریقہ کار بھی اب ناکام نظر آتا ہے جیسا کہ BRICS کی زوال پزیری سے ظاہر ہے۔ جنگوں اور خانہ جنگیوں میں اسلحے کی بڑے پیمانے پر فروخت اور پھر ان بربادیوں کی تعمیر نو کے کاروبار بھی بلند شرح منافع دیتے ہیں لیکن یہ عمل مسلسل جاری نہیں رہ سکتا۔

بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل حکمران طبقات کے نامور معیشت دانوں کا المیہ

یہ ہے کہ جس نظام کی معیشت کے وہ ماہرین ہیں اس میں مرمت کی گنجائش ختم ہو چکی ہے۔ ایسے میں صرف 'جگاڑ' ہی رہ جاتے ہیں جو کر کے نظام کو 'دھکا سٹارٹ' کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات یہ جگاڑ پہلے سے زیادہ پیچیدہ بحران کو جنم دیتے ہیں۔

2008ء کا کریش پہلے کبھی نہ دیکھی گئی نوعیت کا بحران تھا۔ حکمرانوں نے پچھلے بحران سے معیشت کو نکالنے اور سرمایہ داری کو بغیر کسی تنزلی کے مسلسل ابھار دینے کے لئے بینکوں کے سستے قرضوں کو کھلی چھوٹ دے دی تھی۔ نظام کی اقتصادی صحت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف ادوار میں سرمایہ داری کے لئے بینکاری اور دوسرے مالیاتی اداروں کی فنانسنگ کے مختلف کردار ہوتے ہیں۔ معیشت جب صحت مند بنیادوں پر استوار ہوتی ہے تو قرضوں اور آمدن کے درمیان توازن ہوتا ہے اور آمدن سے قرضوں کی ادائیگیاں کم و بیش ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب منافعوں میں کمی ہوتی ہے اور بحران نمودار ہونے لگتا ہے تو زیادہ جوکھم والی سرمایہ کاری ہونے لگتی ہے۔ اسے قیاس آرائی یا سٹہ بازی (Speculative Financing) کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر سٹہ بازی میں لگائی ہوئی رقوم منافع نہ دے سکیں یا دوسرے الفاظ میں جوئے میں ہار ہو جائے تو پھر قرضے ڈوب جاتے ہیں اور بینک خسارے میں جا گرتے ہیں۔ اس نوعیت کی انتہائی خطرناک فنانسنگ اور قرضہ جات پر مبنی سرمایہ کاری کو آج کل بورژوا معیشت کی زبان میں 'پونزی' فنانسنگ کہا جاتا ہے۔

2008ء کے کریش کی وجہ سٹہ بازی پر مبنی بلبلوں کا پھٹنا تھا۔ بینکار اپنے منافعوں کے چکر میں قرضے دیتے ہی چلے جا رہے تھے، جس کا نتیجہ دیوالیوں کی صورت میں نکلا۔ ایسے میں ریاستیں میدان میں کود پڑیں اور بینکوں کو سینکڑوں ارب ڈالر کے بیل آؤٹ دیئے گئے لیکن یہ بیل آؤٹ دیتے دیتے ریاستیں خود دیوالیہ ہونے لگیں۔ اوبامانے صدر بنتے ہی امریکی سرمایہ داری کو بچانے کے لئے ریاستی خزانہ تقریباً خالی کر دیا اور امریکہ دنیا کے مقروض ترین ممالک میں شامل ہو گیا۔ یہی کچھ یورپ اور دنیا بھر کی سرمایہ دار ریاستیں آج تک کر رہی ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ 'مانیٹرازم' (سپلائی سائیڈ معیشت) کی پالیسی کو بچانے اور چلانے کے لئے 'کینشین ازم' کے طریقہ کار استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماضی کے تمام کلاسیکی طریقہ کار بحران سے نکالنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔

اعتراف شکست

9اور 10 جولائی 2016ء کوشنگھائی میں منعقد ہونے والے G20 (دنیا کی بیس بڑی معیشتوں کی تنظیم) کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے چین کے وزیر تجارت 'گاؤ ہو چینگ' کی پریشانی عیاں تھی۔ان کا کہنا تھا کہ عالمی معیشت سست روی کا شکار ہے اور برطانوی ریفرنڈم میں یورپی یونین سے علیحدگی کے ووٹ کے بعد غیر یقینی صورتحال زیادہ گہری ہوگئی ہے۔ہو چینگ نے واضح طور پر کہا کہ ''عالمی تجارت ہچکچاہٹ کا شکار ہے، بین الاقوامی سرمایہ کاری ابھی تک مالیاتی بحران سے پہلے کی سطح پر بحال نہیں ہو پائی ہے، عالمی معیشت کو ابھی تک مضبوط اور مستحکم گروتھ (نمو) کی تلاش ہے''۔

اس سے قبل اپریل میں انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF) نے 2016ء میں عالمی معیشت کی شرح نمو کی پیش گوئی ایک سال میں چوتھی بار کم کرتے ہوئے 3.4 فیصد سے 3.2 فیصد کر دی تھی۔اس کی وجہ کمزور عالمی طلب اور سیاسی عدم استحکام کو قرار دیا گیا تھا۔اس کے بعد پانچویں مرتبہ عالمی معیشت کی نمو کی پیش گوئی کو کم کیا جانا بھی کم وبیش یقینی ہے۔عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کا خیال ہے کہ 2016ء متواتر پانچواں سال ہوگا جس میں عالمی تجارت 3 فیصد سے کم کی شرح سے بڑھے گی۔جنوبی افریقہ کے وزیر تجارت نے اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''تجارت کی نمو میں بہت تیز گراوٹ آئی ہے۔ہم نے WTO سے آج سنا کہ تجارت میں اضافے کی شرح جی ڈی پی کی نمو سے بھی کم رہی ہے اور جی ڈی پی کی نمو بذات خود بہت کم ہے''۔

2016ء میں عالمی معیشت کے گروتھ ریٹ کے حوالے سے 'جے پی مارگن' اور ورلڈ بینک کی پیش بینی آئی ایم ایف سے بھی کم ہے۔آئی ایم ایف کے مطابق گروتھ ریٹ 3 فیصد سے اوپر رہے گا تاہم 'جے پی مارگن' اور ورلڈ بینک کا تخمینہ صرف 2.4 فیصد کا ہے۔زیادہ تر بورژوا معیشت دانوں کے مطابق عالمی معیشت کا گروتھ ریٹ یا شرح نمو فی الوقت 2.5 فیصد ہے جو کہ ''نیچے گرا دینے والی رفتار'' (Stall Speed) کے زمرے میں آتی ہیں (جس طرح کوئی ہوائی جہاز اگر

ہوا میں ساکن یا سست رفتار ہو جائے تو نیچے گر جائے گا)۔یعنی یہ شرح نمو اتنی کم ہے کہ یہاں سے عالمی معیشت واپس تنزلی (Recession) میں گر جائے گی کیونکہ سرمایہ کاری اور کھپت منہدم ہو جائیں گے۔عالمی معیشت کی 2.5 فیصد سے کم شرح نمو کو بورژوا معیشت کے نقطہ نظر سے سرکاری طور پر Recession کی کیفیت قرار دیا جاتا ہے۔

آئی ایم ایف نے جنوری 2016ء میں عالمی معیشت کے 'تناظر' کے حوالے سے جو رپورٹ جاری کی تھی اس کا عنوان ہی ''پست طلب، مخدوش امکانات'' (Subdued Demand, Diminished Prospects) تھا۔رپورٹ کا مجموعی لب ولہجہ انتہائی مایوس کن، اعتماد سے عاری اور خدشات سے بھرپور ہے۔رپورٹ کے مطابق ''2015ء میں عالمی معاشی سرگرمی سست روی سے دوچار رہی۔ابھرتی ہوئی اور ترقی پذیر معیشتوں میں گروتھ، جو کہ عالمی گروتھ کا 70 فیصد ہے، مسلسل پانچویں سال بھی تنزلی کا شکار رہی جب کہ ترقی یافتہ معیشتوں میں معتدل بحالی جاری رہی... چین میں برآمدات اور درآمدات میں کمی توقعات سے بڑھ کے ہے جو کہ کمزور سرمایہ کاری اور کمزور پیداواری عمل کا اظہار کر رہی ہے... چینی معیشت کے مستقبل سے متعلق خدشات کے (منفی) اثرات دوسری معیشتوں پر بھی پڑ رہے ہیں۔پیداواری عمل اور تجارت عالمی سطح پر کمزور ہیں جس کی وجہ چین کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر پست طلب اور سرمایہ کاری میں کمی ہے۔چین کی گروتھ 2016ء میں 6.3 فیصد اور 2017ء میں 6.0 فیصد تک گر جانے کی توقع ہے۔لاطینی امریکہ اور کیریبین کا مجموعی جی ڈی پی 2016ء میں مزید سکڑے گا (یعنی منفی جی ڈی پی گروتھ)۔اس کی وجہ برازیل میں Recession اور دوسرے ممالک میں اذیت ناک معاشی صورتحال ہے''۔

ستمبر 2016ء کے آغاز میں 'ہانگزو' (چین) میں منعقد ہونے والے G-20 ممالک کے سربراہان کے اجلاس کا نتیجہ بھی یہی تھا کہ ''عالمی معیشت بدستور مصائب میں گھری ہے''۔اس حوالے سے آئی ایم ایف کا کہنا تھا کہ 2016ء متواتر پانچواں سال ہوگا جس میں عالمی معیشت کا گروتھ ریٹ 1990ء سے 2007ء تک کی 3.7 فیصد کی اوسط شرح نمو سے کم سطح پر رہے گا۔

دیوہیکل معیشتوں کا زوال

چین گزشتہ پچیس سال میں دنیا کی پیداواری ورکشاپ کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور دنیا بھر کی معیشتوں کے ساتھ ان گنت تجارتی رشتوں میں بندھا ہوا ہے۔ پچیس سال قبل عالمی جی ڈی پی میں چین کا حصہ صرف 4 فیصد اور دس سال قبل 9.6 فیصد تھا جو اس وقت 17 فیصد تک پہنچ چکا ہے۔ چینی معیشت کی شرح نمو بحران سے قبل تقریباً 15 فیصد سے گر اس وقت 6.7 فیصد پر آ چکی ہے۔ چینی معیشت کی سست روی یا بحران جہاں بحیثیت مجموعی عالمی سرمایہ داری (بالخصوص ترقی یافتہ ممالک جو چینی مال کی بنیادی منڈی ہیں) کے بحران کا ناگزیر نتیجہ ہے وہاں چین کو خام مال برآمد کرنے والے افریقہ، لاطینی امریکہ اور آسٹریلیا جیسے خطوں میں بھی بحران کا باعث بن رہا ہے۔ جیسا کہ آئی ایم ایف کی رپورٹ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ لاطینی امریکہ کے تقریباً تمام ممالک میں معیشتیں تیزی سے سست روی کا شکار ہیں یا پھر سکڑ رہی ہیں۔ برازیل جیسی بڑی معیشت باقاعدہ Recession میں ہے اور منفی شرح نمو یا سکڑاؤ سے دوچار ہے۔

عالمی جی ڈی پی میں امریکہ کا حصہ چین کے تقریباً برابر (16 فیصد) ہے۔ امریکہ چین کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر بھی ہے اور چین کی 18 فیصد برآمدات صرف امریکہ سے وابستہ ہیں۔ اگست میں امریکی ادارہ شماریات کی جانب سے معیشت کے کلیدی اعشاریوں کے کچھ اعداد وشمار جاری کئے گئے۔ ان کے مطابق امریکی جی ڈی پی کی حقیقی شرح نمو (افراط زر کو نکالنے کے بعد) 2015ء کی دوسری چوتھائی سے 2016ء کی دوسری چوتھائی تک صرف 1.2 فیصد رہی جبکہ 2 فیصد کی پیش گوئی کی جا رہی تھی۔ کاروباری سرمایہ کاری سالانہ بنیادوں پر 9.7 فیصد سکڑ گئی۔ یہ تین چوتھائیوں (Quarters) میں سرمایہ کاری کے مسلسل سکڑاؤ کا تسلسل ہے جو کہ معیشت کی نازک صورتحال کے ساتھ ساتھ سرمایہ کاروں کے عدم اعتماد کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ سرمایہ کاری میں اضافے کے بغیر معاشی نمو نہیں ہو سکتی اور اس میں گراوٹ معاشی نمو میں مزید کمی کا پیش خیمہ ہے جو پہلے کی نسبت زیادہ گہرے بحران کا موجب بن سکتا ہے اور جس کے گہرے اثرات عالمی معیشت پر مرتب ہوں گے۔

فی الوقت سرمائے کے پالیسی ساز چینی معیشت کے برآمدات سے ہٹ کر داخلی منڈی میں کھپت پر منتقل ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ تجزیہ زمینی حقائق کی بجائے اپنی تسلی پر ہی مبنی ہے۔ چینی معیشت کی بنیاد ہی سستی پیداوار کی ترقی یافتہ ممالک کی منڈی میں برآمد تھی جہاں زیادہ قوت خرید موجود ہے۔ اور چین میں سستی پیداوار کا سب سے بنیادی عنصر سستی مگر ہنرمند محنت تھی۔ سستی محنت یا محنت کشوں کی انتہائی کم اجرتوں سے تشکیل پانے والی چین کی داخلی منڈی میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوسکتی ہے کہ وہاں پیداوار کرنے والے سرمایہ دار مطلوبہ شرح منافع پر اپنا مال فروخت کر سکیں۔ ایسے میں ان کی شرح منافع گر رہی ہے اور معیشت زیادہ گہرے بحران میں گھر رہی ہے کیونکہ 'شرح منافع' سرمایہ داری میں ہر معاشی سرگرمی کا سب سے کلیدی مقصد ہوتا ہے۔ یوں چین کی معیشت ناگزیر طور پر اسکی بیرونی منڈیوں سے جڑی ہوئی ہے اور اُن معیشتوں میں بحران اور طلب میں گراوٹ کا ناگزیر نتیجہ چین میں بحران کی مزید شدت کی صورت میں مرتب ہوگا۔ 2008ء میں بحران کے آغاز کے فوراً بعد چینی معیشت کو سہارا دینے کے لئے بڑے پیمانے پر ریاستی سرمایہ کاری کے پیکج (Stimulus Package) کا طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا جو کہ 600 ارب ڈالر سے زائد پر مشتمل تھا۔ ساتھ ہی ریاستی بینکوں کی جانب سے بے تحاشا قرضے جاری کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس سے معیشت کو کچھ سالوں کے لئے وقتی سہارا تو ملا لیکن ساتھ ہی چین کا قرضہ تیزی سے بڑھنے لگا۔ 2007ء کے بعد سے چین کا مجموعی قرضہ چار گنا اضافے کے ساتھ جون 2016ء میں جی ڈی پی کے 250 فیصد سے تجاوز کر چکا ہے (بعض اعداد و شمار کے مطابق چین کا مجموعی قرضہ جی ڈی پی کے 350 فیصد تک ہے)۔

زائد پیداوار کا بحران

زائد پیداوار کے بحرانات سرمایہ داری کے ارتقا کا ناگزیر نتیجہ رہے ہیں۔ آج کے عہد میں زائد پیداوار کا بحران 'زائد پیداواری صلاحیت' (Over Capacity) کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت عالمی سطح پر بالعموم زائد پیداواری صلاحیت سے دوچار ہیں یعنی جتنی پیداواری صلاحیت موجود ہے اسے سرمایہ داری کے حدود و قیود میں منافع بخش انداز میں بروئے

کار نہیں لایا جا سکتا۔ جب پہلے سے موجود پیداواری صلاحیت مکمل طور پر استعمال نہیں ہو رہی ہے تو ایسے میں نئی سرمایہ کاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور نئی سرمایہ کاری کے بغیر نیا روزگار پیدا ہو سکتا ہے نہ ہی منڈی وسعت اختیار کر سکتی ہے اور نہ ہی معیشتوں کے گروتھ ریٹ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ سرمایہ داری کے پالیسی ساز مسلسل اس مسئلے کی طرف خود اشارہ کر رہے ہیں لیکن درست تشخیص کے باوجود کوئی حل پیش کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ یہ سرمایہ داری کا نامیاتی تضاد ہے اور موجودہ طرز پیداوار کی حدود میں حل نہیں ہو سکتا۔ زائد پیداوار کا سب سے زیادہ ارتکاز چین میں ہے اور چین ایک وقت میں عالمی سرمایہ داری کو آگے بڑھانے والے عامل سے جدلیاتی طور پر اپنے الٹ میں تبدیل ہو کر ایک دیوہیکل بوجھ میں تبدیل ہو چکا ہے اور دنیا بھر کی معیشت کو اپنے ساتھ بحران میں ڈبو رہا ہے۔

5 جون کو امریکہ کے سیکرٹری خزانہ 'جیک لیو' نے واضح الفاظ میں تنبیہہ کرتے ہوئے چینی معیشت کی زائد پیداواری صلاحیت کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ دورہ چین کے دوران جیک لیو کا کہنا تھا: ''چین کی زائد پیداواری صلاحیت معیشت کو 'زنگ لگا کر کھوکھلا کر رہی ہے'... زائد پیداوار صرف چین کا داخلی معاملہ نہیں ہے بلکہ اس کے سٹیل، ایلومینیم وغیرہ کی عالمی منڈیوں پر بے تحاشا اثرات ہیں اور ہم زائد پیداواری صلاحیت کی وجہ سے عالمی منڈیوں میں بگاڑ دیکھ رہے ہیں''۔ چینی معیشت میں کس قدر زائد پیداواری صلاحیت موجود ہے اس کا اندازہ یہاں سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ چین میں سٹیل کی صنعت کی زائد صلاحیت پورے جاپان کی سٹیل کی کل پیداواری صلاحیت سے بھی زیادہ ہے۔ اکانومسٹ کے مطابق ''2004ء سے 2014ء تک عالمی سطح پر سٹیل کی پیداوار میں 57 فیصد اضافہ ہوا اور اس اضافے میں 91 فیصد حصہ صرف چین کی سٹیل ملوں کا تھا''۔ اکانومسٹ مزید لکھتا ہے کہ ''ایک کے بعد دوسری صنعت میں، کاغذ سے لے کر بحری جہازوں اور شیشے تک، یہی صورتحال ہے۔ سکڑتی ہوئی داخلی طلب (Demand) کے سامنے چین کی رسد (Supply) انتہائی زیادہ ہے... 2008ء کے بعد چین کی زائد صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے۔ چین میں پیداوار اور پیداواری صلاحیت کے درمیان فرق 2007ء میں مجموعی طور پر صفر تھا۔ 2015ء میں یہ 13.1 فیصد تک پہنچ چکا ہے اور بھاری صنعت میں اس سے بھی کہیں

زیادہ ہے''۔فنانشل ٹائمز کے مطابق ''چین کی فیکٹریاں اتنا سٹیل، سیمنٹ اور دوسری بھاری صنعتی اشیا پیدا کر رہی ہیں کہ سست روی کا شکار داخلی معیشت انہیں کھپا نہیں سکتی۔ اس کا نتیجہ سستی برآمدات کا سیلاب ہے جو برطانیہ سے لے کر امریکہ تک فیکٹریاں بند اور روزگار ختم کر رہا ہے''۔اس حوالے سے چین کو سخت تنقید کا سامنا ہے اور مغربی سرمایہ دار مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں کہ چین زائد پیداواری صلاحیت کو ختم کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کرے جو ان کی صنعت کو بھی اپنے ساتھ ڈبو رہی ہے۔لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب بڑی دیانتداری سے چین کے وزیر خزانہ 'لوجیوائی' نے خود ہی دے ڈالا کہ ''حقیقت یہ ہے کہ چین کوئی مرکزی منصوبہ بندی پر مبنی معیشت نہیں ہے اور ہمارے پاس (زائد پیداواری صلاحیت میں کمی کا) ایسا کوئی منصوبہ نافذ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔چین میں سٹیل کی صنعت کا 50 فیصد نجی سیکٹر پر مبنی ہے (اور ہم اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتے)''۔دوسرے الفاظ میں چین کے وزیر خزانہ نے اعتراف کیا کہ سرمایہ داری کے تحت اس مسئلے کا حل موجود نہیں ہے۔

یہ زائد پیداواری صلاحیت درحقیقت قرضوں کے ذریعے مصنوعی بنیادوں پر منڈی کے پھیلاؤ کے اس عمل کا ناگزیر نتیجہ ہے جس کے ذریعے گزشتہ کئی دہائیوں سے سرمایہ داری کو چلایا جاتا رہا ہے۔اسی عرصے میں چین نے 'عالمی ورکشاپ' کا درجہ اختیار کیا اور دنیا بھر سے سستی محنت اور سستی پیداوار کے تعاقب میں سرمائے نے چین کا رخ کیا۔جب تک ان کھوکھلی بنیادوں پر معیشت چل رہی تھی اور آگے بڑھ رہی تب تک نہ صرف پیداواری صلاحیت کم و بیش پوری طرح منافع بخش طور پر استعمال ہو رہی تھی بلکہ اس میں اضافہ ہو رہا تھا۔اب جبکہ قرضوں کا بلبلہ عالمی پیمانے پر پھٹا ہے اور بحران کے تحت ہر جگہ منڈی سکڑ رہی ہے لیکن پیداواری صلاحیت تو بدستور موجود ہے۔محدود منڈی کا سامنا لامحدود پیداواری قوتوں سے ہے جنہیں سرمایہ داری نے خود تخلیق کیا ہے لیکن جنہیں یہ نظام انسانیت کی ترقی اور بہتری کے لئے بروئے کار لانے سے قاصر ہے۔

2008ء کے بعد چین میں زائد پیداواری صلاحیت میں اضافے کی ایک اور وجہ عالمی منڈی میں سکڑاؤ کی تلافی کرنے کے لئے شروع کیا گیا ریاستی سرمایہ کاری پر مبنی مذکورہ بالا

Stimulus Package بھی تھا جس نے وقتی طور پر تو بحران کو ٹال تو دیا اور 2010ء میں عالمی سطح پر بحران کے باوجود چین کا گروتھ ریٹ 12 فیصد سے بھی تجاوز کر گیا لیکن اس عمل نے پیداواری صلاحیت میں مزید اضافہ کر کے آنے والے عرصے میں بحران کو زیادہ گہرا کر دیا۔ سرمایہ داری بحران کو جتنا ٹالتی ہے وہ جب نمودار ہوتا ہے تو اتنا ہی گہرا اور پیچیدہ بھی ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ 2009ء سے 2011ء تک چین کی دیوہیکل ریاستی سرمایہ کاری کی وجہ سے عالمی معیشت کی گروتھ کا نصف چینی معیشت کا مرہون منت تھا۔ چین کے وزیر خزانہ کے مطابق ''اس وقت دنیا ہماری بڑی مشکور تھی کہ ہم عالمی شرح نمو میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اب ساری دنیا چین کی زائد صلاحیت کے مسئلے پر انگلیاں اٹھا رہی ہے کہ یہ پوری دنیا کو اپنے ساتھ (بحران میں) ڈبو رہا ہے''۔

زائد پیداواری صلاحیت صرف چینی معیشت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مختلف سطحوں پر تمام ترقی یافتہ معیشتیں اس سے دوچار ہیں۔ امریکہ میں پیداواری صلاحیت کا استعمال 2016ء میں 75 فیصد ہے جبکہ بحران سے قبل یہ 82 فیصد تک تھا۔ 1960ء اور 70ء کی دہائیوں میں یہ شرح امریکہ میں 90 فیصد تک رہی ہے۔ جولائی میں G-20 کے اجلاس کے اعلامیہ کے مطابق ''سٹیل اور دوسری صنعتوں میں زائد (پیداواری) صلاحیت ایک عالمگیر مسئلہ ہے''۔ تیل کی قیمتوں میں حالیہ کمی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

قرضوں کے پہاڑ

2008ء کا مالیاتی کریش اس سے قبل کے لمبے عرصے میں قرضوں کے مجتمع شدہ پہاڑ کے زمین بوس ہونے کا نتیجہ تھا جو ایک کے بعد دوسرے خطے کو اپنی لپیٹ میں لیتا چلا گیا۔ ان قرضوں میں عام صارفین، کارپوریٹ کمپنیوں اور ریاستوں کے قرضے سبھی شامل تھے۔ ان قرضوں کے ذریعے منڈی کو مصنوعی طور پر پھیلایا جاتا رہا، پیداوار کو کھپایا جاتا رہا، تضادات کو دبایا جاتا رہا اور اثاثوں کی قیمتیں بڑھتی رہیں جن کی بنیاد پر سٹے بازی کا بازار گرم رہا۔ مثلاً امریکہ میں سستے اور آسان قرضوں کی وجہ سے ہاؤسنگ اور پراپرٹی کا بلبلہ وسیع ہوتا رہا، سٹے بازی عروج پر رہی اور رئیل اسٹیٹ کے مگرمچھ خوب مال بناتے رہے۔ لیکن کوئی بھی بلبلہ لامتناہی طور پر پھیل نہیں سکتا اور

قیمتوں کو آخر کار اپنی حقیقی سطح پر واپس لوٹنا ہوتا ہے۔ یہ بلبلہ جب پھٹا تو دیوالیے کا سلسلہ شروع ہوا اور امریکہ میں مالیاتی کریش نے پوری دنیا کی معیشت کو ہلا کے رکھ دیا۔ یہ درحقیقت کوئی الگ تھلگ واقعہ یا بیرونی عامل نہیں تھا (جیسا کہ سرمایہ کاری کے معذرت خواہان بیان کرتے ہیں کہ 'بہتر مینجمنٹ' اور قواعد وضوابط سے اس طرح کے بحرانات سے بچا جا سکتا ہے) بلکہ لمبے عرصے سے پکنے والے سرمایہ داری کے داخلی تضادات کا اظہار تھا۔ سرمایہ داری کے بحران کا اظہار سٹاک مارکیٹ سے لے کر رئیل اسٹیٹ اور بینکنگ تک، معیشت کے کسی بھی شعبے میں بلبلے کے پھٹنے یا دیوالیے وغیرہ کے ذریعے ہوسکتا ہے لیکن یہ بذات خود بحران یا بحران کی بنیادی وجہ نہیں ہوتی بلکہ فوری وجہ ہوتی ہے اور نامیاتی تضادات کا واقعاتی اظہار ہوتا ہے۔ 2008ء کا مالیاتی کریش اور اس کے بعد یورپ میں ریاستی قرضوں کا بحران بھی ایسے ہی 'حادثات' تھے جو لمبے عرصے سے چلے آرہی ضرورت کا اظہار تھے۔

قرضہ آج کے عہد میں تاریخی متروکیت سے دوچار سرمایہ دارانہ نظام کے لئے ونٹی لیٹر کے حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے سرمائے کی اس نیم مردہ معیشت کو چلایا جا رہا ہے۔ شرح سود کو کم کر کے سستے قرضوں کے اجرا کا طریقہ کار عام طور پر بحرانات سے نکلنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بحران کی کیفیت میں سستے قرضے سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، صارفین کو دیئے جانے والے قرضے منڈی کو گرم رکھتے ہیں اور یوں وقتی طور پر سرمایہ داری کو بحران سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بنیادی طور پر کینشین ازم کا کلاسیکی طریقہ کار ہے۔ لیکن اب کی بار مسئلہ یہ ہے کہ بحران سے نکلنے کا یہ طریقہ کار بحران سے قبل ہی اس کو مسلسل ٹالنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور بڑی حد تک یہ آپشن استعمال کی جا چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی سالوں (لمبے عرصے میں دیکھا جائے تو کئی دہائیوں) تک ٹلتے رہنے کے بعد بحران زیادہ گہرا ہو کر نمودار ہوا ہے اور اس سے نکلنے کے امکانات بھی اتنے ہی مخدوش ہیں۔ 2008ء سے قبل بھی ترقی یافتہ معیشتوں میں شرح سود کم رکھی گئی تھی جو اِس وقت تاریخ کی کم ترین سطح پر آ چکی ہے۔ بلکہ جاپان، سکینڈ نیویا اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں تو شرح سود منفی میں ہے۔ امریکہ اور یورپ میں یہ صفر سے کچھ ہی اوپر ہے۔

کم شرح سود کا بنیادی مقصد سستے قرضے سرمایہ داروں کو فراہم کر کے انہیں سرمایہ کاری کی

ترغیب دینا ہے لیکن منڈی میں گری ہوئی طلب، شرح منافع کی گراوٹ اور سب سے بڑھ کر زائد پیداواری صلاحیت کی کیفیت میں وہ سرمایہ کاری کیوں کریں گے؟ جب معیشت میں پہلے سے موجود پیداواری صلاحیت ہی پوری طرح بروئے کار نہیں آرہی ہے تو نئی سرمایہ کاری کی کوئی منطق نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ کم شرح سود کے باوجود بھی افراط زر (Inflation) کی بجائے تفریط زر (Deflation) کا رجحان ہے کیونکہ سرمایہ حقیقی معیشت میں جا ہی نہیں رہا ہے۔ کم افراط زر یا تفریط زر کا دباؤ مختلف سطحوں پر کم وبیش دنیا بھر میں موجود ہے جس کی وجہ بحیثیت مجموعی عالمی معیشت کی سست روی ہے۔ تفریط زر جہاں معاشی سست روی سے پیدا ہوتا ہے وہاں جدلیاتی طور پر مزید سست روی کو جنم بھی دیتا ہے۔ ترقی یافتہ معیشتوں میں یہ رجحان زیادہ شدید ہے۔ مثلاً جاپان میں منفی شرح سود کے باوجود افراط زر حالیہ عرصے میں صفر سے بھی نیچے گر گیا ہے یعنی معیشت تفریط زر کا شکار ہے۔ اسی طرح امریکہ میں افراط زر کی شرح ایک فیصد سے بھی کم ہے جبکہ یورپ میں افراط زر کی شرح اس وقت صرف 0.2 فیصد ہے۔ حد سے زیادہ افراط زر جہاں معیشت میں 'ہائی بلڈ پریشر' سے مماثل ہوتا ہے وہاں تفریط زر سرمایہ دارانہ معیشت کیلئے 'لو بلڈ پریشر' کی حیثیت رکھتا ہے۔ تفریط زر سے کرنسی کی قدر بڑھنے لگتی ہے جس سے سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کرنسی کی قدر میں اضافے سے قرضے بھی بڑھنے لگتے ہیں اور پہلے سے قرضوں کے پہاڑ تلے دبی معیشتیں ان میں مزید اضافے کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔

فی الوقت سستے قرضوں کو 2008ء سے پہلے کی طرح اب ایک بار پھر سٹے بازی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ کارپوریٹ کمپنیاں ان قرضوں کو پیداواری عمل میں سرمایہ کاری کے لئے استعمال کرنے کی بجائے اپنے شیئر دوبارہ خریدنے یا دیوالیہ اور نیم دیوالیہ پن سے دوچار چھوٹی کمپنیوں کو اپنے اندر ضم کرنے کے لئے استعمال کر رہی ہیں۔ اسی طرح غیر اعلانیہ دیوالیے سے دوچار کمپنیاں (جنہیں Zombie کمپنیاں بھی کہا جاتا ہے) خود کو 'زندہ' رکھنے کے لئے ان قرضوں پر منحصر ہیں۔ علاوہ ازیں اس عمل سے سٹاک مارکیٹ سے لے کر رئیل اسٹیٹ (جائیداد یا پراپرٹی اور رہائشی تعمیرات وغیرہ کا شعبہ) تک میں نئے بلبلے (Bubbles) بن رہے ہیں جو ایک وقت میں آکر پھٹیں گے تو 2008ء سے بڑے بحران کا موجب بنیں گے۔ جون تا اگست

2015ء میں چینی مارکیٹ کا کریش ایسا ہی بلبلہ پھٹنے کا نتیجہ تھا جس میں چند ہفتوں کے اندر 4 ہزار ارب ڈالر ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ آنے والے دنوں میں کسی اور بڑی معیشت میں اس طرح کی صورتحال پہلے سے بیمار عالمی معیشت پر کاری ضرب لگا سکتی ہے۔ مثلاً 'سی این بی سی' کی جنوری 2016ء کی ایک آن لائن رپورٹ کے مطابق امریکی سٹاک مارکیٹ میں ایک ہزار ارب ڈالر کا ببل موجود ہے جو بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح امریکہ کی رئیل اسٹیٹ اور ہاؤسنگ مارکیٹ میں بھی 2008ء سے قبل کی طرز کے ایک نئے بلبلے کے خدشات ظاہر کئے جا رہے ہیں۔

2008ء کے بعد عالمی سطح پر قرضوں کا حجم مجموعی طور پر کم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھ ہی رہا ہے اور بحران زدہ سرمایہ دارانہ معیشت کا قرضے پر انحصار زیادہ گہرا ہو گیا ہے کیونکہ سرمایہ داری صحت مند اور ٹھوس بنیادوں پر آگے بڑھنے سے قاصر ہے۔ برطانوی جریدے 'انڈیپنڈنٹ' نے اپنی یکم مئی 2016ء کی رپورٹ میں عالمی معیشت میں مسلسل بڑھتے ہوئے قرضوں کے حوالے سے اعداد و شمار شائع کئے ہیں جن کے مطابق 2007ء کے بعد عالمی قرضے میں 57 ہزار ارب (ٹریلین) ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ''(وسیع پیمانے کے) قرضے کے نتائج تباہ کن تھے اور اب بھی عالمی معیشت میں قرضہ عدم استحکام کا بڑا موجب بنا ہوا ہے''۔ 2000ء میں عالمی قرضہ 87 ٹریلین ڈالر یا مجموعی عالمی جی ڈی پی کا 246 فیصد تھا جو 2007ء میں بڑھ کر 142 ٹریلین ڈالر یا جی ڈی پی کا 269 فیصد ہو چکا تھا اور 2014ء کے وسط میں مزید بڑھ کر 199 ٹریلین ڈالر یا جی ڈی پی کے 286 فیصد سے تجاوز کر چکا ہے۔ 2007ء کے بعد اس قرضے میں اضافے کا نصف نام نہاد 'ابھرتی ہوئی معیشتوں' میں جمع ہوا ہے جن میں چین سرفہرست ہے۔ یہ اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ کس طرح آج کے عہد میں نہ صرف معاشی نمو قرضے پر منحصر ہے بلکہ قرضوں کا پھیلاؤ معیشت کی اپنی نمو سے بھی بڑھ کر ہے۔ قرضوں کے ذریعے معیشت کو جب چلایا جاتا ہے تو قرضے کی ضرورت مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ بالکل نشے کی لت کی طرح ہے۔ مثلاً امریکہ میں 1955ء سے 2000ء تک ایک ڈالر کی معاشی نمو کے لئے اوسطاً 1.7 ڈالر کا قرض درکار تھا جبکہ 2000ء کے بعد اتنی ہی معاشی نمو کے لئے 3.30 ڈالر کا قرض درکار ہے۔ اسی سے ملتی جلتی صورتحال چین کی ہے۔

آمدن کے کلاسیکی طریقوں (مثلاً سرمایہ داروں پر ٹیکس) میں ناکامی کے پیش نظر دنیا بھر میں ریاستیں قرضوں پر چل رہی ہیں اور 2007ء کے بعد ریاستی قرضے 25 ٹریلین ڈالر اضافے کے ساتھ 58 ٹریلین ڈالر تک پہنچ چکے ہیں۔ جاپان، امریکہ اور کئی بڑی یورپی معیشتوں (مثلاً پرتگال، سپین، اٹلی) سمیت 10 ممالک کا ریاستی قرضہ جی ڈی پی کے 100 فیصد سے تجاوز کر چکا ہے اور آنے والے عرصے میں یہ مزید بڑھے گا۔ 'انڈیپنڈنٹ' کے مطابق ''ان میں سے بہت سے ممالک میں ریاستی قرضہ ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکا ہے اور کچھ واضح نہیں ہے کہ یہ قرضہ کیسے اور کب کم ہوگا''۔ یہ ممالک درحقیقت یونان سے مماثل صورتحال کا شکار ہیں اور معیشت کو معمولی سا دھچکا بھی فی الوقت سطح کے نیچے دبے ان تضادات کو منظر عام پر لا کر یونان سے بھی بدتر صورتحال پیدا کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یونان کا ریاستی قرضہ بھی بحران کے اوائل میں 'صرف' جی ڈی پی کا 109 فیصد تھا جو کئی سالوں کی بدترین کٹوتیوں (Austerity) اور سماجی بربادی کے باوجود اس وقت 180 فیصد کی سطح کو چھو رہا ہے۔ یونان کا بحران یہ حقیقت بھی واضح کرتا ہے کہ کٹوتیاں ریاستی قرضے میں کمی اور معیشت کو بحران سے نکالنے کا کارگر نسخہ نہیں ہیں جیسا کہ نیولبرل معیشت دان پرچار کرتے ہیں۔ خالصتاً معاشی نکتہ نظر سے بھی کٹوتیوں کے نتائج متضاد ہوتے ہیں اور یونان کی طرح اپنی انتہائی شکل میں یہ معیشت کے سکڑاؤ کا باعث بن سکتی ہیں اور یوں قرض کی ادائیگی کی رہی سہی کسر بھی معیشت میں ختم ہو جاتی ہے۔

نابرابری کی انتہائیں

معاشی ناہمواری یا نابرابری اس وقت انسانی تاریخ کی بلند ترین سطح پر ہے۔ چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز جس طرح بڑھ رہا ہے اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی اور یہ عمل اس نظام کی تاریخی متروکیت کو عیاں کرتا ہے۔ 'آکسفیم' نے اپنی 2016ء کی رپورٹ کا عنوان ہی ''ایک فیصد کی معیشت'' رکھا ہے۔ رپورٹ کی مطابق دنیا کی غریب ترین نصف آبادی کی مجموعی دولت 2010ء کے بعد 38 فیصد مزید گر گئی ہے اور اس میں ایک ہزار ارب ڈالر کی کمی آئی ہے۔ صرف 62 افراد دنیا کی آدھی آبادی (تقریباً 3.5 ارب افراد) سے زیادہ امیر ہیں اور ان کی دولت میں

2010ء کے بعد 500 ارب ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔ 2016ء میں امیر ترین 1 فیصد آبادی کی دولت باقی کی 99 فیصد آبادی سے تجاوز کر چکی ہے۔ آکسفیم کوئی انقلابی نہیں بلکہ خیراتی ادارہ ہے اور اسی نظام کا ایک اوزار ہے لیکن اس کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ ''یہ ناقابل برداشت ہے کہ دنیا کی غریب ترین نصف آبادی کی دولت چند درجن افراد سے زیادہ نہیں ہے... نابرابری کا یہ رجحان مسلسل بڑھ رہا ہے... انتہائی امیر ترین افراد کی دولت میں یہ دھماکہ خیز اضافہ آبادی کی اکثریت بالخصوص غریب ترین لوگوں کی قیمت پر ہو رہا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور امیروں کے لئے قوانین بھی باقیوں سے مختلف ہیں۔ 201 بڑی کمپنیوں میں سے 188 کی ٹیکس ہیونز میں موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ کچھ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔'' یہ الفاظ درحقیقت سرمایہ داری کے پالیسی سازوں کو آکسفیم کی تنبیہہ کے مترادف ہیں کہ معاشی نابرابری اور طبقاتی تضادات جس نہج کو پہنچ چکے ہیں اگر پھٹ پڑے تو پورے نظام کو نیست و نابود کر دیں گے۔

عالمگیر بحران

ہر خطہ معاشی بحران میں گھرا ہے۔ 2008ء کے بعد جو عمل شروع ہوا ہے اس کا اظہار مختلف ممالک میں مختلف اشکال اور سطحوں پر ہو سکتا ہے لیکن اس کی اساس مجموعی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی زوال پزیری اور اس کے خمیر میں موجود تضادات ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک گہرائی میں کرنے کی ضرورت ہے۔ آسٹریلیا سے لے کر افریقہ، لاطینی امریکہ اور کینیڈا تک، چین سے منسلک تمام معیشتیں بحران کا شکار ہیں۔ ''ابھرتی ہوئی معیشتوں'' یا BRICS (برازیل، روس، انڈیا، چین اور ساؤتھ افریقہ) کا بہت چرچہ ماضی میں کیا جاتا رہا ہے کہ یہ معیشتیں عالمی سرمایہ داری کو بحران سے نکالیں گی لیکن سوائے ہندوستان کے باقی کی تمام معیشتیں ابھرنے سے پہلے ہی بیٹھ گئی ہیں۔ ہندوستان کی معاشی ترقی کے بھی آج کل خوب گن گائے جا رہے ہیں لیکن 7 فیصد کا یہ گروتھ ریٹ کھوکھلا ہے اور زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ پائے گا۔ ہندوستان میں ستمبر 2015ء کے بعد 2 ستمبر 2016ء کی دوسری عام ہڑتال نے اس 'ترقی' کی حقیقت کو خوب عیاں کیا ہے۔ یورپی یونین، جو یورپی بورژوازی کی رعونت اور خود اعتمادی کی علامت تھا، آج سب کے سامنے ٹوٹ

پھوٹ رہا ہے۔ یونان کا بحران ختم نہیں ہوا بلکہ منظر عام سے غائب کر دیا گیا ہے۔ قرضوں کے اس بحران میں یونان کے پیچھے کئی ممالک کی طویل قطار لگی ہے۔ ریفرنڈم کے بعد برطانیہ کی معیشت غیر یقینی صورتحال سے دو چار ہے۔ سرمایہ کاری گر رہی ہے اور برطانیہ آنے والے مہینوں میں گہرے بحران میں جا سکتا ہے۔ فرانس اور جرمنی جیسی معیشتیں بظاہر مضبوط اور مستحکم نظر آتی ہے لیکن اندر سے اتنی ہی کھوکھلی ہیں۔ یورپ کی یہ 'سپر طاقتیں' ہزار ہا بندھنوں میں یورپ اور پوری دنیا کی منڈیوں کے ساتھ جڑی ہیں اور عالمی منڈیوں میں کساد بازاری کی سرایت ان معیشتوں میں ناگزیر ہے۔

جاپان کی معیشت کا کئی دہائیوں پر مبنی بحران 2008ء کے بعد اور بھی گھمبیر ہو گیا ہے۔ گزشتہ دس سالوں میں شرح نمو صفر اور ایک فیصد کے درمیان جھول رہی ہے۔ ریاستی سرمائے کے مسلسل ٹیکوں بلکہ ڈرپوں، مالی Stimulus اور محنت کشوں پر نیو لبرل معاشی حملوں کے باوجود 2016ء کی پہلی چوتھائی میں 0.5 فیصد گروتھ کے بعد دوسری چوتھائی میں شرح نمو صفر رہی۔ ریاستی قرضہ جی ڈی پی کے 240 فیصد (10 ہزار ارب ڈالر) تک پہنچ چکا ہے۔ نجی کھپت، حکومتی اخراجات، سرمایہ کاری اور برآمدات سب میں سست روی یا گراوٹ ریکارڈ کی گئی۔

جولائی 2016ء میں سعودی عرب کے زرمبادلہ کے ذخائر 555 ارب ڈالر تک گر چکے ہیں اور صرف جولائی کے مہینے میں ان میں 6 ارب ڈالر کی کمی آئی ہے۔ یہ ذخائر اگست 2014ء میں 737 ارب ڈالر تھے۔ بجٹ خسارہ 98 ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے اور اکتوبر 2016ء میں سعودی عرب 10 ارب ڈالر کا قرض عالمی منڈی سے لینے جا رہا ہے۔ عالمی منڈی میں خام تیل کی قیمت 2014ء کے موسم گرما میں 114 ڈالر فی بیرل سے گر کر اس وقت 50 ڈالر پر کھڑی ہے جس کی وجہ سے سعودی عرب کے علاوہ روس، وینزویلا، متحدہ عرب امارات اور دوسرے کئی تیل برآمد کرنے والے ممالک کی معیشتیں شدید دباؤ میں ہیں۔ روس کی معیشت باقاعدہ Recession میں ہے۔ تیل کی قیمتوں میں گراوٹ کی بنیادی وجہ عالمی معیشت بالخصوص چین کی سست روی ہے جس کی وجہ سے تیل کی طلب میں کمی آئی ہے۔ عالمی معیشت کی مزید سست روی کا مطلب تیل کی قیمتوں میں مزید گراوٹ ہو گا جس کے گہرے معاشی، سیاسی اور سماجی اثرات

آنے والے عرصے میں تیل کی برآمد سے وابستہ معیشتوں پر پڑیں گے۔ اسی طرح ایران پر پابندیاں اٹھنے کے عمل سے ایرانی تیل اگر بڑے پیمانے پر منڈی میں آتا ہے تو تیل کی قیمتوں پر دباؤ مزید بڑھ جائے گا اور ان معیشتوں کا بحران شدید تر ہو جائے گا۔

نظام کی تاریخی متروکیت

2008ء کا 'بریک ڈاؤن' 1929ء کے بعد سرمایہ داری کی تاریخ کا سب سے بڑا کریش تھا۔ اس کے بعد مسلسل بحران اور زوال پزیری کا ایک تسلسل ہے جو مختلف وقفوں سے جاری ہے۔ تاہم مجموعی طور پر زوال پزیری کے لمبے عرصے میں وقتی بحالی (Recovery) کے مختصر ادوار بھی آسکتے ہیں۔ تاہم یہ بحالی بھی 'U' یا "V" شکل کی بجائے 'L' شکل کی ہوسکتی ہے۔ یعنی سرمایہ داری بحران سے قبل کی سطح پر نہیں پہنچ سکتی۔ سرمایہ داری جس نحیف کیفیت سے گزر رہی ہے ایسے میں آنے والے عرصے میں کوئی بھی دھچکا عالمی معیشت کو زیادہ گہرے بحران میں مبتلا کرسکتا ہے۔ بالخصوص امریکہ کی دیوہیکل معیشت کی زوال پزیری عمل انگیز کا کردار ادا کرتے ہوئے عالمی معیشت کو دھڑام کرسکتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کا کوئی بحران حتمی اور آخری بحران نہیں ہوتا۔ یہ نظام خود بخود ختم نہیں ہوسکتا۔ لینن کے الفاظ میں ''سرمایہ داری کسی انت کے بغیر وحشت ہے'' اور اس وحشت سے نجات شعوری انقلابی کاوش کے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی۔

چین

معیشت کا تناظر

2015ء کے وسط میں چین کی سٹاک مارکیٹ کی گراوٹ بڑھتے بڑھتے کریش کی صورت اختیار کرگئی۔ سٹہ بازی اور جوے کا بلبلہ پھٹنے سے اب تک چار ہزار ارب ڈالر 'غائب' ہوگئے۔ 9 کروڑ شیئر ہولڈرز براہ راست طور پر دیوالیہ یا متاثر ہوئے اور خودکشیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ریاستی بینکوں نے گرتی ہوئی شرح نمو کو مصنوعی طور پر اٹھانے کے لئے جو بے پناہ سرمایہ سستے قرضوں کی شکل میں معیشت میں داخل کیا تھا اس پر سٹاک ایکسچینج اور دوسرے شعبوں میں سٹہ بازی کا پہاڑ تعمیر ہوتا رہا جو کہ زمین بوس ہوگیا۔ 4 جنوری 2016ء کو ایک مرتبہ پھر سٹاک مارکیٹ کریش کرنا شروع ہوگئی۔ پہلے 15 منٹ میں ہی منڈی 5 فیصد گر گئی اور حکومتی اداروں نے مزید گراوٹ سے بچنے کے لیے تجارت ہی روک دی۔ 7 جنوری کو ایک اور کریش ہوا اور 15 جنوری تک منڈی 18 فیصد گر چکی تھی۔ اس سے ساری دنیا کی منڈیاں متاثر ہوئیں مثلاً امریکہ کا ڈاؤ جونز (Dow Jones) انڈسٹریل انڈیکس 8.2 فیصد گر گیا۔

2014ء میں چین کا گروتھ ریٹ (شرح نمو) کم ہو کر 7.3 فیصد پر آ گیا جو گزشتہ 24 سالوں میں سب سے کم تھا۔ سولہ برسوں میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ حکومت اپنا مقرر کردہ گروتھ ریٹ کا ہدف حاصل نہیں کر سکی جو 7.5 فیصد تھا۔ 2015ء میں شرح نمو مزید گھٹ کر 6.9 فیصد آ گئی اور 2016ء کی پہلی دو سہ ماہیوں کے دوران یہ 6.7 فیصد رہی۔ فنانشل ٹائمز کے مطابق 2014ء میں چین کے 31 میں سے 30 صوبے اپنی ترقی کا ہدف حاصل نہیں کر سکے تھے۔ جس صوبے نے اپنا ہدف حاصل کیا وہ تبت ہے جو چین کی سب سے چھوٹی اور غریب معیشت ہے۔ یہ اعداد و شمار چین کے 'معجزاتی' عروج کی تنزلی کے انجام کے آغاز کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ سرمایہ داری کا بحران دنیا کی سب سے زیادہ برآمدات کرنے والی معیشت (''مصنوعات کی پیداوار کے انجن'') میں داخل ہو رہا ہے۔

بظاہر 2008ء میں عالمی سطح پر آنے والے بدترین معاشی بحران سے چین عارضی طور پر بچ نکلا تھا۔ 2008ء میں جب جی ڈی پی کا سالانہ گروتھ ریٹ 14.2 فیصد سے گر کر 9.8 فیصد ہوا تو حکومت نے 586 ارب ڈالر کے ایک پیکج کا اعلان کیا۔ اس پیکج کا حجم تو امریکہ کے بیل آؤٹ پیکج جتنا ہی تھا لیکن چین کی معیشت امریکی معیشت کے ایک تہائی تھی۔ چینی حکام 2008ء میں پھٹ کر سامنے آنے والے بحران کی نوعیت اور شدت کو درست طور پر نہیں سمجھ سکے تھے اور انہوں نے سمجھے رکھا کہ یہ معمول کا بحران ہے جو آیا ہے اور جلد ٹل جائے گا اور ہماری پالیسیاں جوں کی توں جاری رہیں گی۔ 586 ارب ڈالر کے پیکج کی وجہ سے مرکزی حکومت کے قومی قرضوں کی شرح میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چین کا قومی قرضہ ماضی میں بہت ہی سست روی سے بڑھتا آ رہا تھا۔ 1978ء میں اس کی شرح صفر تھی۔ 1997ء میں یہ 7 فیصد تک آیا۔ 2003ء میں 20 فیصد سے کچھ ہی کم، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے عالمگیر بحران کی کیفیت میں پبلک اخراجات کے ضمن میں یہ قرضہ 2010ء میں 37 فیصد کو چھو رہا تھا۔ اُس وقت ریاست کی جانب سے بڑے پیمانے پر قرضوں کی فراہمی سے معیشت کو وقتی سہارا ملا۔ لیکن اس کے باوجود عالمی سرمایہ داری کا حصہ ہونے کے باعث چین متاثر ہو رہا تھا اور اس کی برآمدات میں کمی آ رہی تھی۔ اس موقع پر ریاست نے انفراسٹرکچر میں بھاری سرمایہ کاری کی جس کے باعث معیشت چلتی تو رہی اگرچہ پہلے کی نسبت اس کی شرح ترقی کم ہو چکی تھی۔ ان اقدامات کی بھی مالیاتی معیشت کو بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعمیرات اور بھاری صنعت میں وسیع پیمانے پر زائد صلاحیت پیدا ہو گئی۔ پراپرٹی اور دیگر شعبوں میں 'Speculative' بلبلے بننے کے باوجود ریاست نے اس عمل کو جاری رکھا۔ اس وقت چین کو مجموعی قرضہ (ریاستی و نجی) جی ڈی پی کے 282 فیصد سے تجاوز کر چکا ہے اور اس قرضے کے ذریعے ہی چینی معیشت کو مصنوعی طور پر سہارا دیا گیا لیکن یہ عمل ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتا۔ آٹھ سال قبل یہ قرضہ جی ڈی پی کے 160 فیصد کی سطح پر کھڑا تھا۔

عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ ماہرین چین پر امیدیں لگائے بیٹھے تھے اور خیال کر رہے تھے کہ چین کی معیشت پوری دنیا کو معاشی زوال سے باہر نکال لے گی۔ لیکن اس سے صرف عارضی افاقہ ہوا جبکہ بے دریغ قرضوں کی وجہ سے معیشت میں بڑے بلبلے پھولتے چلے گئے۔ پراپرٹی کی منڈی

پھیلتی گئی اور 2010ء میں اپنی انتہا پر ایک اوسط گھر کی قیمت ایک خاندان کی اوسط آمدن سے بارہ گنا زیادہ تھی۔ 2012ء تک معیشت 9 فیصد سے زیادہ شرح تک ترقی کرتی رہی۔لیکن اب پراپرٹی کے بلبلے سے ہوا نکلنی شروع ہوگئی تھی۔اس کے بعد سے چین کی شرح ترقی ہر سال کم ہوتی جا رہی ہے۔

چین نے جب ابھرنا شروع کیا تھا تو بہت سے لوگوں نے اسے سرمایہ دارانہ نظام کے درخشاں مستقبل کی ضمانت سمجھنا شروع کر دیا تھا۔لیکن چین کے ابھارنے صرف سرمایہ دارانہ نظام کے اندرونی تضادات کو تیز کرنے کا ہی کام کیا۔ایک عرصے تک کیلئے تو چینی معیشت کی دھماکہ خیز ترقی نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو آکسیجن فراہم کیے رکھی۔اب یہ سہولت اپنی الٹ میں تبدیل ہوکر جھنجلاہٹ بن چکی ہے۔چینی معیشت میں کی جانے والی بے تحاشا سرمایہ کاری نے بھاری مقدار میں سستی اشیا کی شکل میں اپنا اظہار کیا جسے چین سے باہر اپنے لئے منڈیوں کی ضرورت بڑھتی گئی۔ عالمگیر سطح پر چین کی سستی اشیا کی بھرمار نے ایک دہائی سے زائد عرصے میں زائد پیداوار کے بحران کو اور بھی شدید کیا ہے۔

دیہی علاقوں سے سستی محنت کی بے پناہ فراہمی، جدید مشینری اور تکنیک جسے بھاری ریاستی سبسڈی کی پشت پناہی حاصل تھی،ان سب عوامل نے مل کر چین کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ ایک طاقتور صنعتی بنیاد تعمیر کر سکے۔اس کیفیت نے دنیا بھر میں روزگار اور صلاحیتوں کو تاراج کیا۔جن ملکوں میں مقابلے کی صنعت اور صلاحیت نہ تھی، وہاں فیکٹریاں بند ہوتی چلی گئیں۔چین سے سستی اشیا کے بہاؤ کی وجہ سے غیر ملکی کمپنیاں دہل کے رہ گئیں۔شروع شروع میں تو شرح منافع بہت ہی زیادہ تھا لیکن جیسا کہ مارکس واضح کرتا ہے کہ پھر جب دوسرے ملکوں کے سرمایہ دار اشیا کا ذخیرہ کر لیتے ہیں تو شرح منافع عمومی سطح پر واپس آجاتی ہے۔چین میں ہم اس وقت یہی ہوتا دیکھ رہے ہیں۔بے تحاشا ترقی کا دور اپنی حدود کو پہنچ چکا۔اب چین کو ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے جو سرمایہ دارانہ معیشت کا مقدر بن جاتا ہے۔چین کی کم قیمت کی حامل اشیا نے قریب قریب ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔لیکن اب چینی معیشت کی زائد پیداوار (زائد صلاحیت) ایک عالمگیر مسئلہ بن چکی ہے۔دنیا کی دوسری بڑی معیشت ایک بہت بڑے خطرے کی زد میں آچکی ہے۔

کینیشین اسٹ (ریاستی سرمایہ داری) طرز معیشت کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا تجربہ تھا جو چینی ریاست نے 2008ء کے بعد کیا۔ لیکن اب تضادات کا تناؤ شدت اختیار کر گیا ہے۔ اب وہ سبھی صنعتیں جو کہ اس ریاستی پیکج سے مستفید ہوئی تھیں، جن میں فولاد سے لے کر جہاز رانی اور دھات پگھلانے تک شامل ہیں، زائد صلاحیت (جسے زیادہ بہتر الفاظ میں زائد پیداوار کی گنجائش کہا جانا چاہئے) کے ہاتھوں مفلوج ہو کے رہ گئی ہیں۔ چینی معیشت میں پیدا ہونے والی سست روی بے تحاشا نقصانات کا باعث بنے گی جس کے نتیجے میں صنعتی تنزلی کا ایک تکلیف دہ عمل ضرورت بن جائے گا۔ کیمیکلز سے لے کر سیمنٹ اور فلیٹ سکرین ٹیلی ویژنوں تک چینی صنعت اشیا کی اس قدر فراوانی کا شکار ہو چکی ہے کہ جس کی وجہ سے چین کے اندر اور باہر منافعوں میں بہت کمی واقع ہوتی جا رہی ہے اور اس کمی کی وجہ سے چین کی کمزور ہوتی معیشت کی نقاہت اور بھی بڑھ جائے گی۔

چین ایلومینیم اور سٹیل کی عالمی پیداوار کا تقریباً نصف جبکہ سیمنٹ کی پیداوار کا 60 فیصد پیدا کرتا ہے جبکہ پیداوار میں ہونے والا مزید اضافہ اس کے علاوہ ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک ایسی کیفیت میں ہو رہا ہے کہ جب عالمی معیشت سست روی کا شکار ہے اور برآمدات کی منڈیاں سکڑ رہی ہیں۔ اگرچہ چین میں فولاد کی صنعت اس وقت بام عروج پر ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ اپنی پیداواری صلاحیت کا محض 80 فیصد ہی استعمال کر رہی ہے۔ صنعت سے وابستہ سربراہان اور متعلقہ افسران کا کہنا ہے کہ ہمیں ابھی مزید اس استعمال میں کمی لانا پڑے گی تاکہ شعبے میں توازن کو واپس لایا جا سکے۔ صرف فولاد ہی نہیں سیمنٹ کی صنعت کا بھی یہی حال ہے۔ چین کی انٹر پرائز (صنعتی کاروبار) کنفیڈریشن کے مطابق 2013ء میں سیمنٹ کی دو تہائی پیداوار کو ہی کام میں لایا جا سکا تھا۔

چینی معیشت میں بڑھی ہوئی زائد پیداواری صلاحیت اور کم ہوتی شرح نمو یہ عندیہ دیتی ہے کہ بہت زیادہ تعداد میں لوگ بیروزگار اور دیوالیہ ہوں گے جس کے مضمرات لامحالہ چین کے ہر طبقے کے لوگوں کی نفسیات پر بہت شدید اور گہرے ہوں گے۔ بالخصوص دنیا میں حجم کے لحاظ سے سب سے بڑے چین کے محنت کش طبقے پر اس بحران کا تمام تر بوجھ ڈالا جائے گا۔ یہ عمل دھماکہ خیز واقعات کی راہ ہموار کرے گا۔

سیاست

چین کا موجودہ صدر شی جن پنگ (Xi Jinping) مارچ 2013ء میں برسر اقتدار آیا تو عالمی ذرائع ابلاغ ترقی اور خوشحالی کے ایک نئے دور کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ یہ صدر پہلے سے زیادہ پر اعتماد اور با صلاحیت ہے اور چین کی عالمی سرمایہ داری سے جڑت کو مزید مضبوط کرے گا۔ اسی دوران دس سال صدر رہنے والے ہو جن تاؤ (Hu Jintao) اور اس کے وزیر اعظم وین جی بیاؤ بڑے پیمانے کی کرپشن کے الزامات کا سامنا کر رہے تھے۔ نیو یارک ٹائمز نے رپورٹ دی کہ اپنے اقتدار کے دوران وین جی بیاؤ کے خاندان نے 2.7 ارب ڈالر سے زائد کی دولت خرد برد کی۔ صدر ہو جن تاؤ کا اکلوتا بیٹا افریقی اور یورپی ممالک سے کاروبار میں کروڑوں ڈالر کے فراڈ کے مقدمات کا سامنا کر رہا تھا۔

شی جن پنگ کا ہو جن تاؤ کے دس سالہ دور کے بعد میں آنا چین میں اقتدار کی منتقلی کے متعلق بھی اہم سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ ابھی تک یہ ایک معمہ ہے کہ چین میں نئے صدر اور وزیر اعظم کا انتخاب کیسے اور کیونکر ہوتا ہے۔ چین میں مغربی ممالک کی طرز پر نہ ہی کوئی سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے اور نہ ہی آمریت۔ سٹالنسٹ طرز پر سوویت یونین اور منصوبہ بند چین میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرح یہاں بھی بیوروکریسی میں موجود اعلیٰ اہلکاروں کی ملی بھگت اور پسند و ناپسند سے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ بظاہر چین میں سیاسی طریقہ کار وضع کیا گیا ہے جس کے مطابق چین کی واحد پارٹی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ 2011ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد تقریباً 8 کروڑ کے لگ بھگ تھی جو کل آبادی کا تقریباً 6 فیصد بنتا ہے۔ اس پارٹی میں اب سرمایہ داروں سمیت سماج کے ہر شعبے سے ممبران موجود ہیں۔ پارٹی کے ذریعے ہی حکومت، فوج، معیشت، ثقافتی اور تعلیمی اداروں میں تقرریاں کی جاتی ہیں۔ پارٹی ہی تمام پالیسیاں ترتیب دیتی ہے اور ان پر عملدرآمد کے لیے ریاستی ڈھانچوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔

تحریری طور پر ریاست کا اقتدار اعلیٰ نیشنل پیپلز کانگریس کے پاس ہے جس کے مندوبین کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ 2013ء میں ''پیپلز'' کانگریس کے ہونے والے اجلاس

میں 31 ارب پتی (ڈالروں میں) تھے۔ جبکہ اسی کانگریس کے ساتھ ہونے والی عوامی سیاسی مشاورتی کانفرنس میں 52 ارب پتی تھے۔ یہ وہ ارب پتی ہیں جو قانونی طور پر اپنے اثاثوں کا اعلان کر چکے ہیں۔ غیر قانونی اور غیر اعلان کردہ ارب پتیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کانگریس کی منتخب کردہ مرکزی کمیٹی کی میٹنگ سال میں ایک یا دو دفعہ محض رپورٹیں سننے کے لیے منعقد کی جاتی ہے۔ اس کے ممبران کی تعداد دو سو سے چار سو کے درمیان ہوتی ہے۔ مرکزی کمیٹی اپنے اختیارات پولٹ بیورو کو تفویض کرتی ہے جس کے ممبران کی تعداد 22 ہے اور وہ ہر مہینے میٹنگ کرتے ہیں۔ لیکن چین میں پولٹ بیورو سے بھی زیادہ طاقتور ادارہ پولٹ بیورو سٹینڈنگ کمیٹی (PBSC) ہے جس کے ممبران کی اس وقت تعداد 7 ہے۔ یہی 7 افراد چین کے تمام اہم امور پر فیصلے کرتے ہیں اور آئندہ قیادت کا فیصلہ بھی کرتے ہیں۔ پچھلے صدر ہو جن تاؤ کے وقت PBSC کے ممبران کی تعداد 9 تھی جن میں سے 7 ایک ساتھ ریٹائر ہوئے۔ دو بچ جانے والوں میں سے ایک اس وقت صدر اور دوسرا وزیر اعظم ہے۔

چین کا صدر ریاست کا سربراہ ہوتا ہے اور اس عہدے کے ساتھ پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور سنٹرل ملٹری کمیشن کے چیئرمین کا عہدہ بھی رکھتا ہے۔ ماؤ کے بعد ریاست کے چیئرمین کا عہدہ اس کے اعزاز میں ختم کر دیا گیا تھا۔ ماؤ نے ملٹری کمیشن کے چیئرمین کے عہدے کو ثقافتی انقلاب میں بھرپور انداز میں استعمال کیا تھا۔ ماؤ کے بعد ڈینگ کو اقتدار دلانے میں فوج میں ماؤ کے جانشین ہوگواؤ ننگ (Hua Guofeng) نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ڈینگ نے عہدوں کی بجائے پارٹی، فوج اور بیوروکریسی میں اپنے ذاتی تعلقات کے ذریعے حکومت کی۔ اس کا سب سے بڑا عہدہ نائب وزیر اعظم کا تھا۔ 1989ء کے بعد جب جیانگ زمن چین کا صدر بنا اس وقت ڈینگ کے پاس واحد عہدہ تاش کھیلنے والی ایسوسی ایشن (Bridge Playing) کے اعزازی چیئرمین کا تھا۔ لیکن اس کے باوجود 1997ء میں اپنی وفات تک وہ چین کا طاقتور ترین شخص تھا۔

جیانگ زمن نے 2002ء میں اقتدار ہو جن تاؤ کو دیا۔ اس دوران چین نے بلند ترین شرح ترقی حاصل کیا اور منصوبہ بند معیشت کو حتمی طور پر ختم کرتے ہوئے سرمایہ داری کو چین میں استوار کیا۔ اب شی جن پنگ ایک نئے عہد میں برسرِ اقتدار آیا ہے۔ اس کا والد شی ژانگ شن

1930ء کی دہائی میں گوریلا جنگجو تھا اور انقلاب کے بعد ماؤ کا ڈپٹی وزیراعظم بنا۔ثقافتی انقلاب کے دوران وہ ماؤ کے زیرِ عتاب آیا اور اسے کئی سال نظر بند رکھا گیا۔ماؤ کے بعد ڈینگ کے برسرِ اقتدار آنے پر وہ دوبارہ اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوا۔چین میں سرمایہ داری کی بنیاد رکھنے کے حوالے سے اس کا کردار اہم ہے کیونکہ اس نے شینزن (Shenzhen) اکنامک زون کی بنیاد رکھی تھی۔شی کے برسر اقتدار آنے پر اس کے باپ کے کردار کو مزید نمایاں کیا جا رہا ہے۔موجودہ صدر خود بھی ثقافتی انقلاب کے دوران اپنے پر ہونے والے جبر کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جب اسے محض دیہاتوں میں داخلی جلاوطنی کا شکار ہونا پڑا۔ماضی کے انقلابیوں کی برسرِ اقتدار اولادوں کو ذرائع ابلاغ 'شہزادے' کہتے ہیں جو آج ارب پتی ہو چکے ہیں۔

موجودہ صدر بھی مہنگی گاڑیوں کا شوقین ہے اور اس کے شاہانہ طرز زندگی کے بہت سے قصے میڈیا میں آتے رہتے ہیں۔اس کی بیوی پینگ لی یوان (Peng Liyuan) بھی خبروں کا موضوع بنی رہتی ہے۔ڈینگ کے برسرِ اقتدار آنے پر ماؤ کی بیوی کی گرفتاری کے بعد چینی افسر شاہی اپنی بیویوں کو منظر عام پر نہیں لاتی تھی۔لیکن اب صدر اور خاتونِ اول کسی شاہی جوڑے کی مانند چین پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

شی کی شخصیت کی تشہیر سے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اس طرح مشکل معاشی اور سیاسی فیصلے کرنے میں مدد ملے گی اور وہ سخت فیصلے کر سکے گا۔لیکن دوسری طرف تمام تر بحرانوں اور سماجی انتشار کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوگی۔جدلیاتی طور پر اس کی شخصیت کو جتنا زیادہ ابھارا جا رہا ہے اور اس کی ریاست پر مضبوط گرفت کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اتنی ہی چینی ریاست داخلی تضادات کا شکار ہے اور اس کی اشرافیہ باہمی ٹکراؤ کے عالم میں ہے۔شی نے آتے ہی سٹینڈنگ کمیٹی کے ریٹائر ہونے والے چند سینئر افراد کے خلاف کرپشن کے مقدمے قائم کر دیئے۔ہو جن تاؤ کی صدارت میں تمام تر داخلی معاملات کا سربراہ ژو یانگ کینگ (Zhou Yongkang) تھا۔قانون نافذ کرنے والے اداروں، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور عدلیہ سمیت تمام داخلی معاملات اسی کی زیرِ نگرانی کام کر رہے تھے۔شی نے برسرِ اقتدار آتے ہی یہ تمام اختیارات اپنے پاس رکھے اور سٹینڈنگ کمیٹی کے افراد کی تعداد 9 سے کم کر کے 7 کر دی گئی۔اس کے بعد Zhou کیخلاف بدعنوانی کے مقدمات قائم کر

کے تفتیش کا آغاز کر دیا۔ اس کے بہت سے قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر کے تفتیش کا آغاز کر دیا گیا۔ دو لاکھ کے قریب افراد کو جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے جن میں سے کئی خودکشی پر مجبور ہو گئے۔ یہ صورتحال چین کے حکمران طبقے کی داخلی کشمکش اور انتشار کی وضاحت کرتی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی

کمیونسٹ پارٹی کا مستقبل کیا ہے؟ جب تک معیشت میں استحکام تھا اس وقت تک کمیونسٹ پارٹی کی قیادت صورتحال کو قابو میں رکھنے اور کسی حد تک سماج اور پارٹی کے اندر استحکام برقرار رکھنے میں کامیاب رہی لیکن اب باہمی تضادات کا آغاز ہو چکا ہے جس کا اظہار صدر شی کی جانب سے بد عنوانی کیخلاف ایک مہم کے آغاز میں ہوتا ہے۔ چینی ذرائع ابلاغ میں اس مہم کا یہ واویلا ہے کہ موجودہ صدر بدعنوانی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے پرعزم ہے۔ لیکن اس کا مقصد بدعوانی کا خاتمہ نہیں کیونکہ اس صورت میں تو چین کی پوری ریاست ہی منہدم ہو جائے گی۔ اس کا مقصد اپنے سیاسی مخالفین کو ختم کرنا ہے۔ حکمران طبقے کے باہمی تضادات اسے کمزور کرنے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ بظاہر مضبوط نظر آنے والی دیوہیکل پارٹی کو جب کسی بڑے سنجیدہ طوفان، کسی بڑے معاشی بحران، کسی بڑے طبقاتی تصادم، قومی تصادم یا کسی بھی طرح کے سماجی تصادم کا سامنا کرنا پڑا تو مختلف دھڑے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی، ماضی کی طرح آج نہ پارٹی ہے اور نہ ہی کمیونسٹ۔ بڑے دھماکہ خیز واقعات کے باعث ریاست پر اس کی گرفت ٹوٹ سکتی ہے۔ دولت کی اتنی زیادہ سرائیت کے پیش نظر کسی دھڑے کے مزدوروں کی حقیقی پارٹی بننے کے امکانات نہایت ہی مخدوش ہیں۔

اتنے بڑے ملک کی دیوہیکل بیوروکریسی کے اندر باہم متصادم رجحانات کے مخالف دھڑوں کا ہونا ناگزیر ہے جن کے خیالات اور مفادات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی اور بیوروکریسی کے اندر تضادات کی عکاسی مختلف قانون سازیوں یا بدعنوانی کیخلاف مہمات وغیرہ میں ہوتی ہے۔ تاہم ٹوٹ پھوٹ کا یہ عمل سیدھی لکیر میں چلنے والا نہیں اور اس کا براہ راست تعلق سماج اور معیشت کی کیفیت اور طبقاتی کشمکش کی شورش کی سطح سے ہے۔ اس ''کمیونسٹ پارٹی'' میں

بدعنوانی اور جبر اس انتہا کو ہے کہ اس میں کسی مارکسی رجحان کا کام کرنا ناممکنات میں سے ہے۔شی جن پنگ نے جو مارکسزم کو ابھارنے کا اعلان کیا ہے وہ محض جبر کے ہتھکنڈوں کو کور اور جواز فراہم کرنے کے لیے تھا۔لیکن کروڑوں افراد جو اس سے منسلک ہیں ان کی نچلی نسبتاً محروم پرتوں اور نوجوانوں میں ایسے افراد بھی بہت ہوں گے جو پارٹی کی بڑی ٹوٹ پھوٹ اور محنت کش طبقے کی بڑی بغاوت کی کیفیت میں بالشویک لینن اسٹ پارٹی کی جانب رجحان استوار کر سکتے ہیں۔

سامراجی رجحانات

ناہموار سرمایہ دارانہ استواری اور معیشت کے وسعت اختیار کرنے سے چین کا سامراجی کردار اپنانے کے عمل میں داخل ہونا ناگزیر اقتصادی قانون تھا۔نائیجیریا کے ریاستی مرکزی بینک کے سابق گورنر لامیڈو سانوسی نے 10 جنوری 2015ء کو بیان دیا کہ ''ہم اپنے آپ کو ایک نئے قسم کے سامراج کے سامنے کھول رہے ہیں۔ اس میں چین افریقہ سے خام مال سستے داموں حاصل کرتا ہے اور ان سے تیار کردہ مصنوعات واپس بھیجتا ہے۔لیکن ان کے ساتھ ہنر اور ٹیکنالوجی برآمد نہیں کرتا۔'' چین دنیا بھر میں سرمایہ برآمد کرنے کے ساتھ ساتھ خام مال اور دیگر مفادات کے تحفظ کے لیے عالمی سیاست کے ایک اہم کھلاڑی کے طور پر بھی ابھرا ہے۔چین جہاں لاطینی امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا سے خام مال درآمد کر رہا ہے وہاں سرمائے کی برآمد سے ان براعظموں کی سیاست اور معیشت پر بھی گہرے انداز میں اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ صورتحال دیگر سامراجی قوتوں سے ٹکراؤ کا باعث بن رہی ہے جس میں امریکہ سرِفہرست ہے۔لیکن عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ ہونے کے باعث امریکہ اور چین کے مفادات جہاں ایک دوسرے سے متصادم ہیں وہاں جڑے بھی ہوئے ہیں۔چین امریکہ کو برآمدات کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔2014ء میں امریکہ کا کل تجارتی خسارہ 500 ارب ڈالر سے زائد تھا جس میں 342 ارب ڈالر سے زائد خسارہ چین سے تجارت میں تھا۔2015ء میں یہ خسارہ 365 ارب ڈالر سے بڑھ چکا تھا۔ایسے میں اگر امریکی معیشت مزید گراوٹ کا شکار ہوتی ہے تو چین کی معیشت بھی نئے بحران میں چلی جائے گی۔اس کے علاوہ دنیا میں امریکی ڈالر کے سب سے زیادہ ذخائر چین کے

پاس ہیں جن کا حجم 4 ہزار ارب ڈالر کے قریب پہنچ چکا ہے۔ امریکی ڈالر کو پہنچنے والا نقصان چین کی معیشت کو بڑے دھچکے لگا سکتا ہے۔ دوسری جانب سینکڑوں امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی چین میں بھاری سرمایہ کاری موجود ہے۔ چین کی سستی اور ہنر مند محنت سے وہ اپنے منافعوں میں تیزی سے اضافہ کر رہے ہیں۔ چین میں موجود امریکی چیمبر آف کامرس کی ممبر کمپنیوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے جبکہ 3500 سے زائد افراد انفرادی طور پر اس کے ممبر ہیں۔ دوسری طرف چین کی جانب سے امریکہ میں ہونے والی سرمایہ کاری میں تیزی آ رہی ہے اور 2014ء میں 12 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی گئی۔ 2016ء میں امریکہ میں چینی سرمایہ کاری کا اندازہ 30 ارب ڈالر کا ہے۔ امریکہ کی رئیل اسٹیٹ مارکیٹ میں چین سے ہونے والی سرمایہ کاری 300 ارب ڈالر سے تجاوز کر چکی ہے۔

لیکن اس تمام تر تجارت اور کاروبار میں معاشی رقابت بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ امریکی حکومت پر مسلسل دباؤ ہے کہ چین کے ساتھ تجارتی خسارہ کم کیا جائے۔ اس خسارے کی وجہ سے امریکہ میں روزگار کے مواقع میں ہونے والی کمی کو ایک اہم سیاسی ایشو بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے مختلف خطوں میں خام مال اور معدنی وسائل کے حصول اور منڈیوں کی تلاش کے لیے ہونے والے مقابلوں میں چین اور امریکہ کی حکومتیں اپنے ممالک کے سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک دوسرے کے خلاف مصروف عمل بھی ہیں۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی بنیادی وجہ عالمی سطح پر منڈیوں کی تقسیم اور ان پر اجارہ داری کا حصول ہی تھا۔ آج بھی امریکہ، چین اور یورپی طاقتیں دنیا بھر میں منڈیوں کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مختلف محاذوں پر برسرپیکار ہیں۔ طاقتوں کے موجودہ توازن کے باعث کسی عالمی جنگ کی پیش گوئی تو نہیں کی جا سکتی لیکن چھوٹی جنگوں، تنازعات، پراکسی جنگوں اور خانہ جنگیوں کا تسلسل موجود ہے اور اس میں کمی آنے کا کوئی امکان نہیں۔

چین اور امریکہ کے تعلقات کے حوالے سے دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چین عسکری میدان میں امریکہ سے کہیں زیادہ کم تر ہے لیکن اس کے باوجود کسی تنازعے یا جنگ کی صورت میں امریکی فوج کو بڑا نقصان پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر

مغربی بحرالکاہل میں چین کی عسکری قوت امریکی مفادات کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔انہی خطرات سے نپٹنے کے لیے چین سے ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود امریکہ چین کے قریب اپنی عسکری قوتوں کو بہت زیادہ بڑھا اور مضبوط کر رہا ہے۔ ہونولولو میں موجود پیسیفک کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر موجود ہے جس کی ایک بہت بڑی فوجی بیس بحرالکاہل میں گوام نامی جزیرے پر قائم ہے۔ یہ جزیرہ امریکہ سے 6 ہزار میل کے فاصلے پر جبکہ چین سے 2 ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔امریکہ ہر سال دفاعی ضروریات پر سینکڑوں ارب ڈالر خرچ کرتا ہے۔2013ء میں امریکہ نے اپنے جی ڈی پی کا 3.8 فیصد دفاع پر خرچ کیا جبکہ 2011ء میں یہ 4.6 فیصد تھا جس کا حجم 664.84 ارب ڈالر بنتا ہے۔ 2014ء میں 575 ارب ڈالر دفاع پر خرچ کیے گئے جبکہ 2016ء میں 597 ارب ڈالر خرچ کئے گئے۔عراق اور افغانستان میں شکستوں اور فوجوں کے انخلا کے بعد دفاعی بجٹ میں وقتی کمی ہوئی تھی لیکن اب داعش اور دوسری دہشت گرد تنظیموں کے دوبارہ ابھرنے کے بعد دفاعی بجٹ میں اضافہ متوقع ہے۔دوسری جانب چین اپنے جی ڈی پی کا 2 فیصد سے زائد دفاع پر خرچ کرتا ہے۔2014ء میں اس کا حجم 131.57 ارب ڈالر تھا۔جو 16-2015ء میں 11 فیصد اضافے کے ساتھ 147 ارب ڈالر تک پہنچ گیا ہے۔اس طرح امریکہ کے بعد چین دنیا میں دفاع پر خرچ کرنے والا دوسرا بڑا ملک بن گیا ہے۔

موجودہ صورتحال میں امریکہ اور چین کے براہ راست ٹکراؤ کے امکانات انتہائی کم ہیں اور تضادات کا اظہار دیگر ممالک میں نظر آتا ہے مثلاً پاکستان میں چین کا CPEC منصوبہ اور گوادر پر کنٹرول اور امریکہ کی اس سے بے چینی۔امریکہ بھی چین کے ہمسایہ ممالک میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سفارتکاری اور دیگر ذرائع سے اثر ورسوخ بڑھا رہا ہے تاکہ چین کی بڑھتی ہوئی سامراجی طاقت کو کنٹرول کیا جا سکے۔

چین جہاں ایک سامراجی طاقت کے طور پر پوری دنیا میں سرمایہ برآمد کر رہا ہے وہاں اس کے 20 ہمسایہ ممالک کی سیاست اور معیشت بھی اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔مشرق میں جاپان سے لے کر جنوب میں ویت نام، جنوب مغرب میں ہندوستان اور شمال میں روس تک چین کے ہمسایہ ممالک سے تعلقات کی جہاں ایک لمبی تاریخ ہے وہاں موجودہ عالمی صورتحال میں وہ چین کے

لیے فائدے اور نقصان دونوں کا باعث بن سکتے ہیں۔حال ہی میں جاپان سے چند جزیروں پر قبضے کا ابھرنے والے تنازعہ دونوں ممالک میں حالت جنگ کا باعث بن گیا تھا۔جنوب چینی سمندر کو چین اپنے زیر تسلط علاقہ سمجھتا ہے اور اس پر امریکی ایما پر جاپانی مداخلت اس کے لیے باعث خجالت تھی۔شمالی کوریا کے ساتھ چین کے تعلقات بھی امریکہ، جنوبی کوریا، جاپان اور روس سے تنازعے کا باعث رہتے ہیں۔جبکہ کمبوڈیا کی جانب چینی پالیسی ویت نام اور تھائی لینڈ کے مفادات کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔اسی طرح برما کے ساتھ چین کے تعلقات ہندوستان اور بنگلہ دیش پر اثرات مرتب کر رہے ہیں۔

ان ممالک سے پہلے چین کا سامراجی کردار چین میں موجود مظلوم قومیتوں اور اقلیتوں پر جبر سے واضح ہوتا ہے۔تبت اور سنکیانگ سے لے کر تائیوان اور ہانگ کانگ تک چین کی سامراجی کردار کی حامل ہوتی ہوئی ریاست اپنے تسلط کو بدترین جبر کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہے۔ امریکہ اور دیگر مغربی سامراجی قوتیں چین پر اپنا دباؤ بڑھانے کے لیے اور چینی سامراج کے مقابلے میں اپنے سامراجی مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے ان علاقوں میں چینی ریاست کے خلاف قومی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق کے رجحانات کی پشت پناہی بھی کرتی ہیں۔اسی طرح چین میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، جمہوریت کی عدم موجودگی اور دیگر آمرانہ قوانین پر اکثر شور مچایا جاتا ہے۔لیکن ایسا کرنے والے مغربی ذرائع ابلاغ اور تنظیموں کا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ اس جبر کا شکار عوام کو چھٹکارا دلایا جائے بلکہ ایسا کرنے سے وہ چین کے حکمران طبقے پر دباؤ ڈال کر اپنے مفادات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

امریکی سامراج کی زوال پذیری بھی نئی سامراجی قوتوں کے لیے خلا پیدا کر رہی ہے جس میں چین یہ جگہ لینے کے لیے سب سے زیادہ تیزی سے مصروف عمل ہے۔برکس بینک بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔15 جولائی 2014ء کو ہونے والے برکس ممالک (برازیل، روس، بھارت، چین، جنوبی افریقہ) کے ایک معاہدے کے نتیجے میں 100 ارب ڈالر کی رقم سے اس بینک کا آغاز کیا گیا۔اس کو ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا متبادل بنانے کا اعلان کرنے کا مقصد چین اور دیگر ممبر ممالک کا عالمی اجارہ داری میں اپنے حجم کے مطابق حصے کا حصول ہے۔یہ بینک بھی ورلڈ بینک کی

طرز پر انفراسٹرکچر کے منصوبوں کے لیے سالانہ 34ارب ڈالر تک کے قرضے دے سکتا ہے۔ بینک کی جانب سے قرضے دینے کا آغاز 2016ء میں کیا جا رہا ہے۔ انفراسٹرکچر کے منصوبوں کے علاوہ عالمی سطح پر نقد رقم (Liquidity) کے دباؤ سے نپٹنے اور قرضوں کی ادائیگی میں مدد کے لیے بھی یہ بینک مدد کرے گا۔ اس بینک کی تاسیسی رقم 100ارب ڈالر میں چین سب سے زیادہ 41ارب ڈالر تک حصہ ڈالے گا۔

اس بینک کا مستقبل بھی عالمی سطح پر تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی معاشی صورتحال کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس وقت اس بینک کو قائم کرنے کے لیے مذاکرات کیے جا رہے تھے اس وقت ممبر ممالک کی معیشتیں نسبتاً تیز ترقی کر رہی تھیں جن میں سرفہرست چین کی معیشت تھی۔ لیکن اب معیشتیں روبہ زوال ہیں۔ روس کی معیشت بھی ایک زوال (Recession) کا شکار ہو چکی ہے اور چین کی شرح ترقی بھی سست روی کا شکار ہو کر 7 فیصد کی خطرناک حد سے نیچے گر رہی ہے۔

لیکن اس بینک کے قیام کا بنیادی مقصد چینی سامراج کا عالمی بینکاری اور معیشت میں اپنا حصہ تسلیم کروانا ہے۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف سرمایہ داری کے عروج کے دور میں پروان چڑھے تھے اور ان کا ایک سامراجی کردار ابھر کر سامنے آیا تھا۔ آج عالمی سطح پر سرمایہ داری میں وہ گنجائش نہیں کہ کوئی نیا بینک ان جیسا سامراجی کردار حاصل کر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کے زوال کی شدت جہاں سامراجی قوت کو بکھرنے پر مجبور کر رہی ہے وہاں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی سامراجی اجارہ داری کے بھی کمزور ہو کر بکھرنے کے امکانات موجود ہیں۔

اس تمام صورتحال میں ان کی باہمی کشمکش میں شدت آئے گی اور عالمی معیشت میں نئے تضادات جنم لیں گے۔ لیکن روس کے ساتھ تعلقات میں جہاں چین امریکی سامراج کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے وہاں امریکہ کے ساتھ جڑے اس کے مفادات ان تعلقات کو زیادہ گہرا اور مؤثر بنانے میں بھی رکاوٹ ہیں۔ وسطی ایشیا اور کوریا میں بھی چین اور روس کے مفادات کا ٹکراؤ موجود ہے۔ وسطی ایشیا میں تضادات سے نپٹنے کے لیے 2001ء میں شنگھائی کوآپریشن آرگنائزیشن (SCO) قائم کی گئی۔ اس تنظیم کے ذریعے چینی حکمران وسطی ایشیا میں اپنے سامراجی مفادات کا تحفظ جاری رکھے ہوئے ہیں اور خطے میں روس کے تسلط کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی۔

2010ء میں چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن گیا تھا اور جاپان کو تیسرے نمبر پر دھکیل دیا۔لیکن آج بھی جاپان چین سے زیادہ ایجادات کر رہا ہے، زیادہ سرمایہ کاری کر رہا ہے اور جدید تکنیک کی حامل مصنوعات کی برآمدات میں چین سے آگے ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ جاپان ایک فوجی قوت بھی ہے اور دنیا کا چھٹا بڑا دفاعی بجٹ رکھتا ہے۔دو لاکھ 37 ہزار افراد پر مشتمل جاپان کی سیلف ڈیفنس فورسز جدید تکنیک سے لیس ہیں۔چین اور جاپان جغرافیائی طور پر بھی قریب ہیں اور جنوب چینی سمندر میں شنگھائی سے صرف 500 میل کے فاصلے پر جاپان کی حدود کا آغاز ہو جاتا ہے۔

چین اور جاپان کے درمیان تناؤ کی ایک تاریخ ہے، اس تناؤ کی فوری وجہ سینکا کو جزائر ہیں۔جاپان کے زیر تسلط جزائر پر چین اپنا حق تسلیم کروانا چاہتا ہے۔چین، جنوب چینی سمندر میں واقع ان جزائر کے قریب سمندر سے گیس حاصل کر رہا ہے جسے جاپان اپنی ملکیت سمجھتا ہے جاپان تائیوان میں بھی چین سے تصادم کی تحریکوں کو غیر اعلانیہ مدد فراہم کرتا رہتا ہے۔چین اور تائیوان کے تنازعے کی طوالت جاپان کے مفاد میں ہے جس سے وہ چین کی بڑھتی ہوئی عسکری قوت کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی بجائے تائیوان کی جانب مبذول رکھ سکتا ہے۔شمالی کوریا کے مسئلے پر بھی جاپان اور چین کا تنازعہ موجود ہے۔جاپان اسے اپنے مفادات کے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے جبکہ چین کے لیے وہ ایک منڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ان تنازعات کے باوجود چین اور جاپان کی باہمی تجارت بھی بڑے پیمانے پر موجود ہے اور باہمی تعلقات کی ایک لمبی تاریخ ہے۔چین میں کمیونسٹ نظریات پہنچانے کا آغاز بھی جاپان سے ہی ہوا تھا جب مارکس اور اینگلز کی تحریروں کے جاپانی تراجم چین پہنچے اور ان کا چینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔حکمران طبقات کی قومی تعصب اور جنگوں کی تاریخ کے باوجود دونوں ممالک کے محنت کشوں کی طبقاتی جڑت کی بھی ایک تاریخ ہے۔

کوریا کے دونوں ممالک کی مشترکہ آبادی 7 کروڑ سے زائد ہے۔جنوبی کوریا دنیا کی چوتھی بڑی معیشت ہے جس کا حجم 800 ارب ڈالر سے زائد ہے۔جزیرہ نما کوریا کی دو حصوں میں تقسیم عالمی سامراجی قوتوں کی بندر بانٹ کا نتیجہ ہے۔شمالی کوریا کی سٹالنسٹ حکومت سوویت یونین اور منصوبہ بندی پر قائم سوشلسٹ چین کی امداد پر انحصار کرتی رہی ہے جبکہ جنوبی کوریا امریکی سامراج

کے زیرِ تسلط رہا ہے۔آج بھی دونوں ممالک کے محنت کش عوام میں اس تقسیم اور دشمنی کے خاتمے کے لیے بڑے پیمانے پر خواہش موجود ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام مصنوعی تقسیموں کے ذریعے اپنا تسلط جاری رکھتا ہے۔اسی تقسیم کے باعث دونوں جانب بڑے پیمانے پر اسلحے پر اخراجات کیے جاتے ہیں۔سرمایہ دار چین بھی خطے میں اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ان تعصّبات کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔چین کے جنوبی کوریا سے سرحدی تنازعات بھی ابھر رہے ہیں۔

چین کے ساحلوں سے شروع ہو کر 2 ہزار میل کے فاصلے تک موجود ان حدود پر چین اپنا سامراجی تسلط قائم رکھنے کے لیے امریکی حلیفوں جاپان، جنوبی کوریا، فلپائن اور تائیوان سے مسلسل برسرِ پیکار ہے۔شمال میں جاپانی جزیروں سے شروع ہو کر تائیوان کے جنوبی حصے تک اس پٹی پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنے کے لیے چین اپنی بحری قوت میں بھی اضافہ کر رہا ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں موجود دیگر ہمسایہ ممالک سے بھی سمندر میں مچھلی کے حصول سے لے کر وہاں موجود معدنی وسائل پر تسلط اور اہم بحری گزرگاہوں کے کنٹرول پر چین کے ان ممالک سے تنازعات موجود رہتے ہیں۔امریکی سامراج بھی چین کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتا رہتا ہے۔

جنوب چینی سمندر سے ہر سال ایک کروڑ ٹن مچھلی حاصل کی جاتی ہے جبکہ تیل اور گیس کے حصول کے لیے بھی اب یہاں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی جا رہی ہے۔چین اس علاقے میں تسلط کے لیے یہاں موجود امریکی بحری بیڑوں سے تنازعات ابھار رہا ہے اور ان کے لیے یہاں مشکلات پیدا کر رہا ہے۔امریکہ جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی تنظیم آسیان (ASEAN) کے ذریعے خطے میں اپنے سامراجی مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔اس تنظیم کے ممبران میں انڈونیشیا، ملائشیا، فلپائن، سنگاپور، تھائی لینڈ، برونائی، کمبوڈیا، لاؤس، برما اور ویت نام شامل ہیں۔ 2010ء میں امریکہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ جنوب چینی سمندر میں جہاز رانی کے لیے ''قومی مفاد'' میں مکمل آزادی رکھتا ہے۔جغرافیائی طور پر دور ہونے کے باوجود یہ اعلان امریکہ کے سامراجی عزائم کا اظہار ہے۔آسیان ممالک پہلے ہی چین پر دباؤ ڈالتے رہے ہیں کہ وہ خطے میں جارحیت سے دور رہے۔ایسے میں کسی بھی سرحدی تنازعے پر حالتِ جنگ کا ابھرنا حیران کن نہیں ہوگا۔خاص طور پر کسی بھی

ملک میں انقلابی تحریکوں کے ابھرنے کی صورت میں ان قومی تعصبات کو ابھارا جاسکتا ہے تاکہ بیرونی دشمن کا خوف مسلط کر کے عوام پر جبر جاری رکھا جائے۔ چین میں محنت کش طبقے کی ابھرنے والی تحریکوں کو قومی شاونزم اور بیرونی جنگوں کے خطرے کو ابھار کے کچلنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

چینی صدر شی جن پنگ کی شاہراہِ ریشم کی تعمیر کو تجزیہ نگار دوسری عالمی جنگ کے بعد کے امریکی ''مارشل پلان'' سے تشبیہہ دے رہے ہیں۔ یورپ اور جاپان میں اس مارشل پلان کی ''تعمیرِ نو'' سے امریکہ نے اپنا سامراجی تسلط قائم کرنے کے عزائم کو پورا کرنے میں اہم کردار استوار کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چین کی اس سرمایہ کاری کو ''چینی مارشل پلان'' قرار دیا جارہا ہے۔

1980ء میں چین اور افریقہ کی باہمی تجارت کا حجم ایک ارب ڈالر تھا جو 2000ء میں 10ارب ڈالر ہوگیا۔ 2006ء میں یہ حجم 55ارب ڈالر پہنچ گیا جس کے بعد چین افریقہ سے تجارت کرنے والا دوسرا بڑا ملک بن گیا۔ 2006ء میں امریکہ کی افریقہ سے تجارت کا حجم 91ارب ڈالر تھا۔ 2009ء میں چین امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ گیا جب اس تجارت کا حجم 114ارب ڈالر تک پہنچ گیا۔ 2012ء کے اختتام تک یہ حجم 198.5ارب ڈالر تھا جب امریکہ کی افریقہ سے تجارت 99.8ارب ڈالر تھی۔ افریقہ میں چین کی سب سے زیادہ تجارت جنوبی افریقہ سے ہے جس کا حجم 20.2ارب ڈالر سے زائد ہے۔ 2012ء میں چین نے گھانا کو 3ارب ڈالر کا قرضہ دیا جو اس کے کل جی ڈی پی کا 10فیصد تھا۔

افریقہ میں چین سے تجارت کرنے والے اہم ممالک میں انگولا، سوڈان، چاڈ، لیبیا، کانگو، نائیجیریا، ایکویٹوریل گنی، گیبون اور کیمرون شامل ہیں۔ یہ سب چین کو تیل بیچتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں سے تانبا، خام لوہا، معدنیات اور کپاس بھی چین کو برآمد کی جاتی ہے۔ چین نے ڈی آر کانگو کی تانبے اور کوبالٹ کی معدنیات کے حصول کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے۔ اسی طرح افریقہ چین کی مصنوعات کے لیے ایک منڈی کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہاں الیکٹرانک کی مصنوعات سے لے کر، ہلکی صنعتی مصنوعات اور مکینیکل اور الیکٹریکل کی صنعت کی مصنوعات بڑے پیمانے پر فروخت ہوتی ہیں۔

افریقہ بالخصوص مالی اور جنوبی سوڈان میں چین کی فوجی مداخلت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ جلد

ہی چین جبوتی میں افریقہ میں پہلی بحری عسکری بیس کی تعمیر شروع دے گا۔ یہ بیس آبنائے باب المندب میں ہوگی جو نہر سوئز اور بحیرہ احمر کو خلیج عدن اور بحر ہند سے ملاتی ہے۔

افریقہ میں موجود دوسرے سامراجوں بالخصوص امریکی اور فرانسیسی سامراج کے ساتھ چین کے تناؤ اور ٹکراؤ کے امکانات ہیں اور یہ خونریز پراکسی جنگوں کی شکل اختیار کر سکتا ہے جن میں نہ صرف مقامی بدعنوان حکمرانوں کو استعمال کیا جائے گا بلکہ قومی، لسانی، قبائلی اور دیگر تعصبات کو ابھار کر اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس سامراجی جنگ میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت کے ساتھ ساتھ لاکھوں لوگ مسلسل غربت اور بیماری میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے۔

لاطینی امریکہ میں بھی چین خام مال کے حصول کے لیے سرگرم ہے۔ اس براعظم کی سب سے بڑی معیشت برازیل ہے جو چین کو خام لوہا اور زرعی اجناس فراہم کر رہا ہے جن میں سویابین، اناج، گوشت وغیرہ شامل ہیں اور چینی مصنوعات کی ایک منڈی بھی ہے۔ دونوں ممالک باہمی تجارت میں ڈالر کی بجائے اپنی کرنسیوں کو بھی استعمال کر رہے ہیں۔ چلی اور پیرو بھی چین کو خام لوہا اور تانبا فراہم کر رہے ہیں۔ ارجنٹائن سے چین سویابین، گوشت اور دوسری زرعی پیداوار حاصل کر رہا ہے۔ وینزویلا میں چین نے تیل کی پیداوار کے لیے درجنوں ارب ڈالر کے قرضے دیئے ہیں جس کے باعث گزشتہ عرصے میں وینزویلا کی معیشت امریکی اثر و رسوخ سے باہر نکلنے کا فائدہ اٹھاتی رہی ہے لیکن وینزویلا کی موجودہ معاشی صورتحال اور سرمایہ داری کا خاتمہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ان کی واپسی سنگین حد تک مشکوک ہوگئی ہے۔ کیوبا سے بھی تجارت میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ لاطینی امریکہ میں اپنی مصنوعات کی فروخت اور خام مال کے حصول کے لیے وہ امریکہ کے سامراجی تسلط کے منرو نظریے (Monroe Doctrine) کو چیلنج کرتا رہا ہے۔ امریکہ آج تک اس براعظم کو اسی پالیسی کے تحت اپنا پچھواڑہ سمجھتا رہا ہے۔

ایرانی بندرگاہوں کے توسط سے خلیج فارس تک رسائی چین کی امریکی سامراج کے خلاف خطے میں ایک اہم پیش رفت ہے۔ لیکن مشرقِ وسطیٰ میں چین اور سعودی عرب کے درمیان تجارتی، اقتصادی اور فوجی ساز و سامان کے تعلقات ان کے اپنے اپنے بدلتے مفادات کے تحت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ان میں ''گرمائش'' بھی پیدا ہو رہی ہے۔ سعودی امریکہ سے رعایتیں حاصل

کرنے کے لئے یہ تعلقات بڑھا رہے ہیں جبکہ چین خام تیل کا پیاسا ہے۔

سامراجی مقاصد کے لیے بھی امریکہ ہندوستان کی ریاست کو خطے میں چین کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کرنے کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے۔چین اور ہندوستان کے مابین ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے میں واقع سرحدی تنازعات پر شدید تضادات موجود ہیں۔تبت اور ارونا چل پردیش میں یہ زیادہ واضح ہو کر ابھرے ہیں۔ماؤ کے انقلاب کے بعد چینی حکومت نے برطانوی سامراج کے افسر ہنری میکموہن کی نقشے پر 1914ء کے شملہ معاہدے کے تحت کھینچی ہوئی لکیر میکموہن لائن (MacMahon Line) کو آج تک تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔چین کی بحری قوت میں اضافے کے ساتھ بحر ہند میں بھی نئے تنازعے ابھرنے کے امکانات موجود ہیں۔لیکن اس دوران چین بھارت کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر بن کر بھی ابھرا ہے اور 2014ء میں 65 ارب ڈالر کی دوطرفہ تجارت کی گئی جسے 100 ارب ڈالر تک لے جانے کا ہدف ہے۔اس مساوات میں ہندوستان کا چین سے تجارتی خسارہ 40 ارب ڈالر تک کا ہے۔جسے ہندوستان کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔برما میں زمینی پل کے ذریعے بھی سڑک اور ریل کے تجارتی راستے بڑھائے جا رہے ہیں۔

پاکستان کے ذریعے بھی چین ہندوستان سے دشمنی نبھاتا رہتا ہے۔پاکستان جہاں چینی مصنوعات اور اسلحے کی ایک منڈی ہے وہاں گوادر کی بندرگاہ کے ذریعے مشرق وسطیٰ کے تیل اور دیگر اشیا کی تجارت کے لیے اہم گزرگاہ کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔لیکن حکمرانوں کی پاک چین دوستی دونوں ممالک کے عوام کے منافی ہے۔پاکستان میں ابھرنے والی انقلابی تحریکوں کو کچلنے کے لیے پاکستان کے حکمران جہاں چینی حکمرانوں کی سامراجی حمایت حاصل کریں گے وہاں یہ تحریکیں چین کے محنت کشوں میں تحرک اور ان کی حمایت کا باعث بنیں گی۔یہی کیفیت چین میں محنت کشوں کی کسی بڑی تحریک کے پھٹنے کی صورت میں بھی جنم لے گی۔

طبقاتی جدوجہد کا تناظر

چینی معیشت کی سبھی کامیابیاں اور کامرانیاں چین کے محنت کشوں کی ہی مرہون منت ہیں جو کہ وکٹوریہ عہد کے برطانیہ کے محنت کشوں کی طرح انتہائی نامناسب کم اجرتوں پر کام کرنے پر

مجبور چلے آرہے ہیں۔ چین جسے اپنے تئیں سوشلسٹ چین سمجھا اور قرار دیا جاتا ہے وہاں دنیا کی امارت اور غربت کی سب سے بڑی خلیج ہے۔ چین کے اندر ایک نئی بورژوازی پیدا ہو چکی ہے اور وہ بھی اس قسم کی مراعات اور عیاشیوں سے لیس ہے کہ جس کا آبادی کا بہت بڑا حصہ تصور تک بھی نہیں کر سکتا ہے۔ چین پر ایک انتہائی چھوٹی لیکن ایک انتہائی غیر معمولی امیر ترین اقلیت کا تسلط ہے جو ایک طرف ریاست کو کھا رہی ہے تو دوسری طرف یہ چین کے محنت کشوں کا بھی بدترین استحصال کرتی چلی آرہی ہے۔ لیکن چین کے سرمایہ دار طبقے کی بنیادیں انتہائی خستہ ہیں۔ ڈیڑھ ارب کی آبادی کے ملک میں کروڑ پتیوں (امریکی ڈالروں میں) کی تعداد 1.2 ملین ہے جو کہ کل آبادی کا 0.1 فیصد ہے۔ ان کروڑ پتیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے لیکن اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ چین کی سرمایہ داری کس قدر کمزور اور ناہموار ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے نیچے ان سے کم لوٹنے والے فیکٹری منیجروں، ڈائریکٹروں، فورمینوں، انجینئروں، افسر شاہی اور دیگر بیوروکریٹوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو کہ ریاست اور پارٹی کے اداروں پر براجمان ہے۔ اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ مل کر یہ لوگ ایک اسٹیبلشمنٹ تشکیل دیئے ہوئے ہیں۔

آج دنیا بھر میں استعمال ہونے والے پرتعیش ساز و سامان کی 35 فیصد کھپت چین میں ہوتی ہے۔ ''بارکلیز کیپیٹل'' کے مطابق اس شعبے کی 70 سے 80 فیصد شرح پیداوار چین کی کھپت میں اضافے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ 2013ء میں چین کی پرتعیش مصنوعات کی منڈی 18.9 ارب ڈالر تک پہنچ گئی تھی۔ ''BNP پاری باس'' (بینک) کے مطابق 2020ء تک یہ چار گنا بڑھ جائے گی۔ چین کی اشرافیہ 90 ارب یورو اس شعبے میں خرچ کر رہی ہے۔ جبکہ پرتعیش مصنوعات کی قیمتیں یورپ کی نسبت 40 سے 50 فیصد زیادہ ہیں۔ 2014ء میں چین کے بالادست طبقات کے خاندانوں نے بیرون ملک عیاشی کے لئے 10 کروڑ دورے کئے۔ ان میں زیادہ تر ''شاپنگ'' کے لئے تھے۔ جبکہ اس وقت چین کی کل آبادی میں سے صرف 4 فیصد کے پاس پاسپورٹ ہیں۔ لیکن اس سب کو مدنظر رکھنے کے باوجود بھی آبادی کی ایک بہت بڑی اکثریت نہ صرف معاشی دولت سے محروم ہے بلکہ اس طاقت سے بھی جو اس کی بدولت میسر آتی ہے۔ دولت کے اس بدترین ارتکاز کے حامل امیروں، ان کے امیرزادوں اور امیرزادیوں کو عوام کی جانب

سے مسلسل حقارت اور مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ اور خاص طور پر اس کیفیت میں کہ جب چین کو ''سوشلسٹ'' ملک تصور کیا جاتا ہے۔ ہر ادارے میں ہر سطح پر ہونے والی مکروہ ترین بدعنوانی نے اس حقارت و نفرت کو اور بھی شعلہ انگیز بنا دیا ہے۔

چند ایک انتہائی بدعنوان افسروں کو پھانسی کی سزاؤں کا بھرپور پروپیگنڈہ کر کے ان کو عبرت کا نشان بنانے کی مہم درحقیقت اس لئے مشہور کی جاتی ہے کہ ان کی مدد سے عام چینیوں کے غم و غصے کو کم کیا جائے۔ جبکہ اس سے یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ بدعنوانی کی شرح کو بھی روکا جا سکے جو معیشت کو اتنا کھوکھلا کر رہی ہے کہ اس کے پورے ڈھانچے کے وجود کو خطرہ ہے۔ لیکن بدعنوانی اور لوٹ کھسوٹ ایک افسر شاہانہ و مطلق العنان طرز کی حکمرانی کا لازمی حصہ ہوا کرتی ہے۔

محنت کشوں کی نئی نسل کسی طور بھی تیار نہیں ہے کہ وہ کم اجرتوں اور خراب صورتحال میں کام کرے، جسے بدحال دیہاتوں سے آنے والی محنت کشوں کی پرانی نسل کے محنت کش کام ملنے کی غرض سے قبول کر لیا کرتے تھے۔ چینی سماج میں اضطراب کی کیفیت کا اندازہ چین میں ہونے والی کام کی جگہوں پر ہڑتالوں، مظاہروں اور خودکشیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے ہوتا ہے۔ یہاں احتجاج کو سختی سے کچل دیا جاتا ہے اور جہاں چند ایک ہی حفاظتی قانونی حقوق میسر ہیں وہ بھی لاگو ہونا کم سے کم ہو رہے ہیں۔ اس کیفیت میں چین میں بغیر کسی پیشگی انتباہ کے کسی بھی وقت اچانک بڑے دھماکے ہو سکتے ہیں۔ یہ کسی طور کوئی حادثہ نہیں ہے کہ چین کی حکومت پہلی بار اپنے بیرونی دفاع سے کہیں زیادہ اپنے اندرونی دفاع پر خرچ کر رہی ہے۔

مزدور تحریک

سرمایہ داری کی ترویج کے ساتھ ساتھ طبقاتی تفریق میں بھی بے انتہا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس سے چین کے اندر بھڑکتی ہوئی طبقاتی کشمکش کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چین اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ عدم مساوات والا ملک ہے۔ مجموعی صورتحال یہ ہے کہ اوپر کے 20 فیصد لوگ کل قومی آمدنی کا 50 فیصد استعمال کرتے ہیں جبکہ نیچے کے 20 فیصد لوگوں کو محض 4.7 فیصد حصہ ملتا ہے۔ یہ اعداد و شمار اقوام متحدہ کی رپورٹ سے لیے گئے ہیں جو ایک مضمون

کی شکل میں ژن ہاؤ نیوز ایجنسی نے شائع کی ہے۔اسی مضمون میں کہا گیا ہے کہ ''محنت اور سوشل سکیورٹی کی وزارت کے انسٹی ٹیوٹ آف لیبر اینڈ ویج سٹڈی'' کی ایک رپورٹ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ 2003ء سے چین میں آمدنی کا فرق بہت تیزی سے بگڑتا آیا ہے اور اب یہ 'نارنجی' (Orange) کی سطح کے خطرے پر پہنچ گیا ہے جو اس ادارے کے معیار کے مطابق دوسری سب سے خطرناک سطح ہے۔اگر کوئی موثر اقدامات نہ اٹھائے گئے تو یہ مزید بگڑ کر 'سرخ' (Red) سطح پر پہنچ سکتا ہے جو سب سے خطرناک سطح ہے۔''

اقوام متحدہ کی اس رپورٹ کی بنیاد گنی (Gini) کے پیمانے پر رکھی گئی ہے جو کسی بھی ملک میں عدم مساوات ناپنے کا ایک شماریاتی آلہ ہے۔صفر کا مطلب ہوتا ہے ''مکمل مساوات'' جبکہ ایک کا مطلب ہوتا ہے ''مکمل عدم مساوات''۔چین میں یہ پیمانہ 0.45 تک پہنچ چکا ہے۔بین الاقوامی سطح پر قابلِ قبول معیار کے مطابق جب کسی ملک میں گنی کا پیمانہ 0.40 تک پہنچ جائے تو صورتحال ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔چین میں یہ پیمانہ نہ صرف 0.40 کی حد تک پہنچ چکا ہے بلکہ اس سے آگے جا چکا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

چینی معیشت میں سست روی ایک بہت بڑے بحران کا پیش خیمہ ہے جس میں یہ اندازے بھی لگائے جا رہے ہیں کہ آنے والے عرصے میں چین کا گروتھ ریٹ 6 فیصد سے بھی نیچے گر سکتا ہے۔ایسی صورت میں چین میں طبقاتی تضادات پھٹنے کی جانب بڑھ سکتے ہیں اور نئے انقلابی طوفان ابھریں گے۔چینی حکمران اسے ایک ''نیا معمول'' قرار دے رہے ہیں اور اس پکتے ہوئے لاوے کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔لیکن اگر چین میں موجود مزدور تحریک پر نظر دوڑائیں تو صورتحال واضح ہوتی ہے۔گروتھ ریٹ میں کمی کو نیا معمول قرار دینے سے محنت کشوں کی تکالیف اور اذیت کو کم نہیں کیا جا سکتا جو ہر روز فیکٹریوں کی بندش سے بیروزگاری اور محرومی کا سامنا کر رہے ہیں اور ان کی تنخواہوں کی عدم ادائیگی میں اضافہ ہو رہا ہے، کم از کم اجرت میں اضافہ نہیں ہو رہا اور سوشل سکیورٹی ادا نہیں کی جا رہی۔

چائنہ لیبر بلیٹن کے مطابق 2014ء میں کم از کم محنت کشوں کی 1378 ہڑتالیں اور احتجاجی مظاہرے ہوئے جو 2013ء کی تعداد (656) سے دوگنا اور 2012ء کی تعداد (382) سے تین

گنا زیادہ ہیں۔ 2014ء کی آخری سہ ماہی میں 569 ہڑتالیں ہوئیں جو سب سے زیادہ ہیں۔ سی این این کی ایک رپورٹ کے مطابق 2015ء میں چین میں 2700 ہڑتالیں اور صنعتی محنت کشوں کے مظاہرے ہوئے جبکہ 2016ء میں مئی تک ان کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ اسی رپورٹ کے مطابق حکومت نے کوئلے اور سٹیل کی ریاستی صنعتوں میں 18 لاکھ ملازمتیں ختم کرنے کا اعلان کیا ہے جس کے پیش نظر صنعتی تصادم اور ہڑتالیں بڑھیں گی۔

ان اعداد و شمار سے نظر آتا ہے کہ چین میں ہونے والی ہڑتالوں اور مظاہروں کی رپورٹنگ میں اضافہ ہوا ہے لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ چین میں طبقاتی کشمکش میں شدت آ رہی ہے اور تضادات تیز ہو رہے ہیں۔ جنوب میں واقع گوانگ ڈونگ صوبہ چین کی مزدور تحریک کا مرکز ہے اور زیادہ تر ہڑتالیں یہاں ہوئی ہیں۔ ان بڑھتی ہوئی ہڑتالوں کی مختلف وجوہات ہیں جن میں چین کے محنت کش طبقے کا بڑھتا ہوا شعور سب سے کلیدی وجہ ہے اس کے علاوہ معیشت میں سست روی اور سرمایہ داروں کا سستی لیبر کی خواہش میں اندرونی علاقوں کی جانب رخ کرنا شامل ہے۔

ان ہڑتالوں میں اضافہ چین کے حکمران طبقے کے لیے چناونی ہے۔ ماضی میں ترقی کے ادوار میں حکومت ایسی ہڑتالوں میں مذاکرات کے لیے سہولت کار کا کردار ادا کرتی تھی لیکن اب وہ ان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہڑتالوں کے دوران پولیس کی مداخلت اور گرفتاریوں کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً یوی یوین کی ہڑتال میں پولیس نے نہ صرف ہڑتالی مزدوروں پر تشدد کیا بلکہ اپنے کتے لے کر فیکٹری میں داخل ہو گئی تا کہ مزدوروں کو ڈرا کر دوبارہ کام پر لگایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت خود مختار ٹریڈ یونینز پر جبر کر رہی ہے اور مزدور رہنماؤں کو بھی ہراساں اور انہیں زیادہ عرصے کے لیے گرفتار کر رہی ہے تا کہ انہیں کنٹرول کیا جا سکے۔ اس کا مقصد محنت کشوں کو سرکاری ٹریڈ یونین فیڈریشن کی جانب دھکیلنا ہے۔ آل چائنہ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین چین کی سرکاری اور واحد قانونی یونین ہے۔ پچھلے 25 سالوں میں چین کا معجزاتی سرمایہ دارانہ صنعتی عروج اس معیشت کا مرہون منت تھا جو سرمایہ داری کو ختم کر کے منصوبہ بند طرز پر 1949ء کے انقلاب نے استوار کی تھی۔ اس سے جنم لینے والے انفرسٹرکچر اور ہنر مند اور بہتر صحت رکھنے والے مزدور طبقے کو اس سرمایہ دارانہ ترقی اور استواری کے لیے استعمال کیا گیا۔ لیکن

جس دور میں چین نے یہ ترقی کی وہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے عروج کا نہیں بلکہ زوال کا عہد تھا۔ اس تاخیر زدہ چینی سرمایہ داری کے ابھار کا جلد تنزلی میں چلے جانا ایک عالمی معاشی اکائی میں ناگزیر تھا۔ لیکن اس سے جو تضادات ابھریں گے وہ چین میں ایک مضبوط اور زیادہ بلند شعور والے پرولتاریہ کی بغاوت کو بھڑکائیں گے۔ شی جن پنگ ایک طرف جبر کو تیز کر رہا ہے لیکن پھر اسکے اشتعال پیدا کرنے کے خطرے سے ڈر کر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لیکن قومی شاونزم اور جبر سے طویل عرصے تک طبقاتی کشمکش کے آتش فشاں کو پھٹنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ اس عمل میں طرح طرح کے عناصر اور واقعات تناظر کا رخ مختلف اطراف میں موڑ سکتے ہیں لیکن انقلابی سوشلزم کا تناظر چین میں ایک منظم بالشویک پارٹی کے فقدان سے پیچیدگی اختیار کر سکتا ہے۔

چین کی معیشت میں مزید سست روی اجرتوں میں مزید کمی کرے گی اور حالات کار مزید بدتر ہوں گے۔ یہ بیروزگاری میں بھی اضافہ کرے گی اور کام کی دستیابی میں مزید بے یقینی پیدا ہو گی۔ ہر سال محنت کی منڈی میں آنے والے نئے ایک کروڑ افراد کو روزگار کی فراہمی کے لیے چین کی معیشت کا کم از کم 7.2 فیصد کی شرح سے ترقی کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس سطح کی ترقی چینی معیشت کے لئے قصہ ماضی بن چکی ہے۔ یہ تمام صورتحال زیادہ بڑی ہڑتالوں، تحریکوں او راحتجاجوں کو جنم دے گی جن میں محنت کش زیادہ بڑے پیمانے پر منظم ہونا شروع ہوں گے۔ چین اب جس 'نئے معمول' میں داخل ہو چکا ہے وہاں صرف معاشی ترقی میں گراوٹ ہی نہیں بلکہ داخلی تضادات اور طبقاتی کشمکش بھی تیز ہو گی۔ چین کا محنت کش طبقہ جاگ رہا ہے۔

آنے والے دور میں چین کے محنت کش طبقے نے ایک کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ نپولین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''جب چین جاگتا ہے تو ساری دنیا لرزتی ہے۔'' نپولین کی بات کو آسان لفظوں میں بیان کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کا سویا ہوا دیو چین کا پرولتاریہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مزدور طبقے کا اجتماع ہے۔ جب وہ اٹھ کھڑا ہو گا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکے گی اور اس سے تمام تر عالمی صورتحال بدل جائے گی۔ چین کا انقلاب اس کرۂ ارض پر سوشلزم اور نسلِ انسانی کے کمیونسٹ مستقبل کی نوید بنے گا۔

ہندوستان

مودی سرکار

دنیا کی سب سے زیادہ غربت پالنے والی سب سے بڑی جمہوریت کے دوسال قبل ہونے والے انتخابات میں تین دہائیوں بعد کسی پارٹی کو مکمل پارلیمانی اکثریت حاصل ہوئی۔ 31 فیصد ووٹ حاصل کرنے والی ہندو بنیاد پرست بی جے پی کی فتح کا جشن نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے سرمایہ داروں نے منایا۔ نریندرا مودی کو اندرا گاندھی کے بعد ہندوستان کا سب سے طاقتور وزیراعظم قرار دیا جارہا تھا۔ مودی کے اقتدار میں آنے سے سرمایہ دار اس لئے پھولے نہیں سمارہے تھے کہ ان کے خیال میں وہ استحصال، لوٹ مار اور منافع خوری کے راستے میں حائل ہر رکاوٹ اپنی روایتی وحشت اور جبر سے گراڈالے گا۔ سامراج اور حکمران طبقے کی جانب سے اپنے مفادات کے لئے ایک عیار مذہبی جنونی شخص کا استعمال سرمایہ دارانہ نظام کے تاریخی زوال کا اظہار ہے۔

2014ء کے انتخابات بی جے پی کی جیت نہیں بلکہ عوام کی سیاسی روایت کا درجہ رکھنے والی کمیونسٹ پارٹیوں کی ایک اور شکست تھی۔ مرحلہ وار انقلاب کے نظریئے اور جمہوریت اور سیکولرازم کے مرحلے میں جکڑی کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت محنت کش طبقے کو سرمایہ داری کی ذلت اور استحصال سے نجات کا کوئی لائحہ عمل اور پروگرام فراہم کرنے سے قاصر رہی۔ ناامیدی سے دو چار عوام کی بڑی تعداد نے یا تو انتخابی عمل میں حصہ نہیں لیا یا پھر اپنی قیادت سے بددلی اور مایوسی کا ووٹ مودی کو ڈالا۔ حکمران طبقے کی پشت پناہی کے علاوہ مودی کو سیاسی بنیادیں تقریباً تیس کروڑ افراد پر مشتمل درمیانے طبقے نے فراہم کیں۔

نریندرا مودی کی حکومت جارحانہ نیولبرل معاشی پالیسیوں کو سماجی، سیاسی اور ثقافتی جبر کے تڑکے کے ساتھ لاگو کررہی ہے۔ جواہر لعل یونیورسٹی کے طلبہ پر جبر، گائے کا گوشت کھانے والوں پر بی جے پی کے غنڈوں کا تشدد اور قتل، لکھاریوں پر جبر، دلتوں پر تعصّباتی ظلم اور کشمیر میں ریاستی دہشت گردی کا نیا آغاز، یہ سب واقعات صرف چند مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی متشدد فوجی

کاروائیاں، عورتوں سے زیادتی کے خطرناک حد تک بڑھتے ہوئے واقعات، مزدوروں اور نوجوانوں پر ہونے والے جبر کے واقعات کو کارپوریٹ سیکٹر کا گماشتہ میڈیا رپورٹ ہی نہیں کرتا۔ مودی کی یہ ڈھٹائی اور جارحیت خارجی محاذ پر بھی داخلی محاذ کی طرح ہی جاری ہے۔ مقامی اور بین الاقوامی میڈیا نے اس کے بیرونی دوروں کو خوب اجاگر کیا ہے۔ مودی نے سعودی عرب اور قطر اور ہر اس جگہ کا دورہ کیا ہے جہاں کوئی ہندوستانی حکمران شاذ و نادر ہی گیا ہوگا۔ اپنے حالیہ پانچ ممالک کے دورے میں اس نے ہندوستان کی بلند معاشی شرح نمو اور 'جمہوری روایات' کے بارے خوب شیخی بگھاری ہے۔ قطر میں اس نے ڈینگیں ماریں کہ انڈیا کی شرح نمو دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور امریکہ میں اس نے عالمی سرمایہ داری کے حالیہ معاشی زوال سے نکلنے کے لیے 'ڈیموکریٹک گروتھ انجن' کی بات کی۔ ایک عالمی معاشی زوال، جس سے بحالی کے امکانات بہت کم ہیں، کے دوران کارپوریٹ میڈیا 'ہندوستان کے معاشی معجزوں' کے گن گا رہا ہے۔ اس لفاظی کو مودی عیارانہ طریقے سے انڈیا کی تیس کروڑ سے زائد بحران زدہ مڈل کلاس کو لبھانے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ لیکن ہندوستان کی دو تہائی سے زیادہ آبادی بدترین مصائب، غربت اور محرومی کی زندگی گزار رہی ہے۔

اکانومسٹ کے مطابق ''بھارت کے 'منہ نوچ لینے' والے میڈیا نے وزیراعظم مودی کو خاصی چھوٹ دی ہوئی ہے۔'' مودی آخر اسی طبقے کا نمائندہ ہے جو میڈیا چینلز کا بھی مالک ہے۔ مودی سرکار اس وقت کارپوریٹ ٹیکس میں کمی، کسٹم ڈیوٹی میں چھوٹ، مزدور یونین کے خاتمے اور کسانوں کی زمینیں ہتھیانے کی قانون سازی جیسی ''اصلاحات'' کر رہی ہے جن سے مقامی اور ملٹی نیشنل اجارہ داریوں کی شرح منافع میں تیزی سے اضافہ ہو سکے گا۔ یہ اقدامات عوام کو زندہ درگور کرنے کے مترادف ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی کارپوریٹ میڈیا ان ''اصلاحات'' کو تیز تر کرنے کی ترغیب مسلسل مودی کو دے رہا ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ امریکی سامراج جیسے ''انسانی حقوق'' اور ''آزادی'' کے ٹھیکیدار مودی کی مذہبی فسطائیت اور ماضی کے جرائم کو مکمل فراموش کئے ہوئے ہیں۔ وزیراعظم بننے سے پہلے مودی کو امریکہ کا ویزا نہیں ملتا تھا۔ اب مودی نیویارک میں ہزاروں کی ریلی سے خطاب کرتا ہے۔ چین کے صدر نے اسے اپنے آبائی

قصبے بلا کر مہمان نوازی کی۔ آسٹریلیا سے لے کر جاپان، کینیڈا اور یورپ تک، سب حکمران اس کے پرستار بنے ہوئے ہیں، اس کے ساتھ ذاتی تعلقات استوار کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اور مودی ہے جس کی رعونت سامراجی حکمرانوں کی ان حرکات سے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے کھلے بندوں ''سارک مائنس ون'' کی پالیسیوں کو فروغ دینا شروع کر دیا ہے۔ یعنی پاکستان کے علاوہ تمام سارک ممالک سے تعلقات اور تجارت کو بہتر بنائے گا۔

معیشت

چین کے بعد ہندوستان کو عالمی ڈوبتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کا بڑا سہارا سمجھا جا رہا تھا۔ اس صدی کی پہلی دہائی کا جائزہ لیا جائے تو ہندوستان کی اوسط شرح نمو 2001ء سے 2009ء تک تقریباً 10 فیصد سالانہ رہی۔ لیکن اسی عرصے میں انتہائی غربت میں رہنے والوں کی تعداد، 77 کروڑ سے بڑھ کر 86 کروڑ 30 لاکھ ہوگئی۔ مودی سرکار کے ایک سال میں امارت اور غربت کی خلیج مزید بڑھی ہے۔ 'کریڈٹ سوئس' کے مطابق ہندوستان میں 82 ہزار ارب پتی ہیں۔ روزگار کی منڈی میں ایک کروڑ افراد ہر سال داخل ہو رہے ہیں۔ اس نظام کی ''ترقی'' جہاں غربت میں اضافہ کرتی ہے وہاں اس کی سرمایہ کاری کا کردار بھی بالکل الٹ ہو گیا ہے۔ یہ سرمایہ کاری نیا روزگار پیدا کرنے سے قاصر ہے، الٹا ڈاؤن سائزنگ کے ذریعے روزگار میں کمی ہی کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں 'بجاج' اور 'ٹاٹا موٹرز' جیسی کمپنیوں میں نئی سرمایہ کاری پرانا روزگار بھی چھین رہی ہے۔ شرح منافع میں اضافے کے لئے انسانی محنت کو ٹیکنالوجی سے تبدیل کیا جا رہا ہے اور جہاں انسان درکار ہیں وہاں بھی کم سے کم مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

1991ء میں لبرلائزیشن کے بعد سے ہندوستان کے عوام کی ذلت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ آدھی سے زائد آبادی بیت الخلا سے محروم ہے۔ بجلی کی فراہمی کی صورتحال بھی کم و بیش یہی ہے۔ اقوام متحدہ کی نئی رپورٹ کے مطابق ''ہندوستان دنیا کے سب سے زیادہ بھوک کا شکار لوگوں کا گھر ہے۔'' مئی 2015ء کی رپورٹ کے مطابق تقریباً بیس کروڑ افراد باقاعدہ قحط سے دوچار ہیں۔ چین کی انتہائی سستی مگر ہنرمند لیبر اور فی کس 52 ہزار ڈالر آمدن کی امریکی منڈی عالمی سرمایہ داری

کو بحران سے نکالنے میں ناکام ہیں۔ان حالات میں ہندوستان کی کھوکھلی معیشت کیا کر لے گی؟ سامراج اور بھارتی سرمایہ داروں کی توقعات پر مودی پورا نہیں اتر پا رہا ہے۔فی الوقت ہندوستان کی 7 فیصد سے زائد کی شرح نمو کا بہت چرچا سامراجی ذرائع ابلاغ کر رہے ہیں اور ''ابھرتی ہوئی منڈیوں'' کا فریب پھر سے مسلط کر کے سرمایہ داری کی ساکھ بحال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔لیکن روس، چین، جنوبی افریقہ اور برازیل وغیر جیسی نام نہاد ابھرتی ہوئی معیشتوں اور منڈیوں (جو سب اس وقت بحران میں جا چکی ہیں یا گراوٹ سے دوچار ہیں) کی طرح ہندوستان میں معیشت کا مستقبل بھی عالمی سرمایہ داری کے زوال کے اس عہد میں خوش آئند نہیں ہے۔یہ بلند شرح نمو ہندوستان کے کروڑوں محنت کشوں کی محرومی اور غربت میں کمی نہیں لا سکتی۔الٹا یہ بلند گروتھ ریٹ طبقاتی اور سماجی تضادات کو بھڑکانے کا موجب ہی بنے گا جو دھماکہ خیز انداز میں پھٹ بھی سکتے ہیں۔

غربت

اس وقت دنیا میں غربت کا سب سے زیادہ ارتکاز ہندوستان میں ہے۔تیس سال پہلے ہندوستان میں دنیا کی غربت کا پانچواں حصہ موجود تھا جبکہ آج دنیا کی ایک تہائی سے زیادہ غربت یہاں موجود ہے۔اس وقت سرکاری طور پر ہندوستان کی آبادی کا 29.8 فیصد حصہ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے۔لیکن سرکاری اعداد و شمار پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔غربت کی اس تعریف میں وہ لوگ آتے ہیں جن کی روزانہ کی آمدنی 28.65 روپے سے کم ہو جبکہ دیہاتوں میں یہ رقم 22.42 روپے ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی حقیقی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ اعداد و شمار کے مطابق 30 روپے کمانے والا غریب نہیں! یونیورسٹی آف آکسفورڈ کی جانب سے شائع کئے جانے والے غربت کے MPI انڈیکس کے مطابق ہندوستان میں 64 کروڑ افراد خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں (کل عالمی غربت کا 40 فیصد)۔بی بی سی پر گزشتہ عرصے میں شائع ہونے والی رپورٹوں کے مطابق انڈیا کی آدھی آبادی نہ صرف بیت الخلا بلکہ بجلی سے بھی محروم ہے۔یو نیسیف کے حالیہ اعداد

وشمار دکھاتے ہیں کہ دنیا میں کم خوراکی کے شکار ہر تین میں سے ایک بچہ ہندوستان میں ہے۔ اسی طرح ملک میں پانچ سال سے کم عمر کے 42 فیصد بچے کم وزنی کے شکار ہیں جبکہ 58 فیصد بچوں کی جسمانی نشوونما بگڑی ہوئی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے حکمرانوں کے درمیان ہتھیاروں کے انبار لگانے کے ساتھ ساتھ غربت اور بربادی پھیلانے کا مقابلہ بھی بہت سخت ہے!

گلوبل ریسرچ کی ایک رپورٹ میں کولن ٹوڈ ہنٹر نے لکھا ہے، ''غربت کا مسئلہ ہندوستان میں بار بار اپنا سر اٹھاتا رہتا ہے۔ پلاننگ کمیشن بار بار خط غربت کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ ہندوستان میں خط غربت سے چھیڑ چھاڑ ایک اچھا مشغلہ بنا ہوا ہے۔ ہندوستان کے بیہودہ حد تک امیر حکمران طبقات کے لیے غربت ایک ہزیمت بنی ہوئی ہے جو خلائی پروگرام، جدید ہتھیاروں، سپورٹس ٹاؤنز، شرح ترقی کے اعداد و شمار، فارمولا ون کے ریسنگ ٹریک اور بڑی عمارتوں کے ذریعے ہندوستان کو ایک ابھرتی ہوئی سپر پاور دکھانا چاہتے ہیں''۔

تیس لاکھ خاندانوں، جو کل خاندانوں کی کل تعداد کا صرف 1.25 فیصد ہے، کے پاس ایک لاکھ ڈالر سے زائد انویسٹیبل فنڈز (Investable Funds) کی موجودگی کو پھر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ہندوستان دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی فہرست میں شامل ہے۔ مودی نے شیخی بگھاری ہے کہ ہندوستان کی شرح نمو 7.5 فیصد ہے جبکہ وہ یہ بات بھول گیا کہ غربت کے خاتمے کی شرح 0.8 فیصد ہے، جس کا آبادی میں اضافے کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یہ منفی میں آتا ہے جو بیس سال پہلے بھی یہی تھا۔

جمہوریت

آبادی کا 75 فیصد دو ڈالر سے کم یومیہ پر زندگی گزار رہا ہے، مغربی زرعی کمپنیوں کی وجہ سے دو لاکھ کسان خودکشی کر چکے ہیں اور ملک کے بڑے حصے پر فوجی قوانین لاگو ہیں۔ اس کے باوجود سیاست دان اور میڈیا ہندوستان کی سرمایہ داری کے معجزوں کی بات کرتے ہیں اور اسے جمہوریت کی بڑی کامیابی قرار دیتے ہیں۔ دھوکہ بازی اور منافقت ہندوستان کے حکمران ٹولوں کی سیاست اور ثقافت کا حصہ بن چکی ہے۔ لیکن اس سیارے کی آبادی کے پانچویں حصے کو استحصال اور سرمایہ

دارانہ جبر کے تحت زیادہ دیر تک مجبور نہیں رکھا جا سکتا۔

ہندوستان کے کارپوریٹ سرمایہ دار طبقات نے ہندو بنیاد پرستوں کو اقتدار میں پہنچایا ہے۔ یہ حقیقت خود ''آزادی'' کے بعد سماج پر مسلط ہونے والے حکمران طبقات کی رجعتی فطرت کی عکاس ہے۔ کانگریس اور اپوزیشن کی دوسری پارٹیوں کے پاس کوئی متبادل نہیں ہے۔ جمہوریت اور سیکولرازم کے نعروں میں محنت کشوں کے لئے کوئی کشش نہیں ہے۔ بایاں بازو اور کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت اب بھی انقلابی راستہ چننے سے کترا رہی ہے۔ لیکن جلد یا بدیر محنت کشوں کو بغاوت کرنا ہو گی۔ جس وقت ہندوستان کا محنت کش طبقہ اور پرولتاریہ جدوجہد کے میدان میں اترے گا، سب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ اگر کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت انقلابی سوشلزم کا لائحہ عمل دینے میں ناکام رہتی ہے تو تحریک نئے سیاسی مظاہر اور قیادت کو جنم دے گی۔ 2 ستمبر 2015ء کی ملک گیر عام ہڑتال، جسے ''بھارت بند'' کا نام دیا گیا، کے ذریعے ہندوستان کے محنت کش طبقے نے ایک بار پھر اپنی انقلابی صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ اس ہڑتال میں 15 کروڑ سے زائد محنت کشوں نے حصہ لے کر مودی سرکاری کی مزدور دشمن نیولبرل پالیسیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ آنے والے عرصے میں مزدور تحریک زیادہ جارحانہ رخ اختیار کر کے انقلابی سمت میں گامزن ہو سکتی ہے اور مودی کے حملے انقلاب کو آگے بڑھانے والے تازیانے کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سماج

عام طور پر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ برصغیر کی تقسیم نے پاکستان میں بنیاد پرستی اور رجعت کو پروان چڑھایا۔ یہ صرف آدھا سچ ہے۔ بٹوارے نے ہندوستان میں بھی رجعت کو پروان چڑھایا۔ بی جے پی کا ابھار اور مودی کا حکومت میں آجانا اس خوفناک حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ 15 اگست 1947ء کو نہرو نے دہلی میں کھڑے ہو کر مقدر کے ساتھ ملنے کی بات کی تھی، ہندوستان کو ایک روشن مستقبل کی طرف بڑھنا تھا لیکن سب کچھ الٹا ہو گیا۔

آج کے ہندوستان کی سماجی اور ثقافتی اقدار، جو زیادہ تر وسیع پیٹی بورژوازی (مڈل کلاس) پر حاوی ہیں، ہوس زر، لالچ اور خود غرضی ہیں۔ شاپنگ اور صارفیت (کنزیومرازم) ہندوستان کی

مضطرب مڈل کلاس کی ترجیحات بنی ہوئی ہیں جب کہ آبادی کا وسیع حصہ معاشی سائیکل سے ہی باہر ہے۔ کارپوریٹ میڈیا مغربی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی وفادار ہر حکومت کی حمایت کرتا ہے اور ملک کے غریب ترین لوگوں کو 'اندرونی دشمن' کے طور پر پیش کرتا ہے۔

ہندوستان کی اپنی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' معدنیات سے بھرپور چھتیس گڑھ، اڑیسہ، جھارکھنڈ اور آندرا پردیش کے صوبوں میں ہو رہی ہیں جہاں ریاستی حکومتیں سامراجی کانکنی کی کمپنیوں کے ساتھ سینکڑوں معاہدے کر رہی ہیں۔ تین لاکھ سے زائد لوگوں کو زبردستی بے دخل کر دیا گیا ہے۔ مغربی اور ہندوستانی کارپوریٹ ٹولے اب ہندوستان کے نئے نوآبادیاتی آقا ہیں۔ مغربی دانشور اپنی کج نظری کی وجہ سے ہندوستان کو روحانیت، اخلاقیات اور روشن خیالی کی سرزمین کہتے ہیں جبکہ بیرونی سرمایہ داروں کے لیے یہ لوٹ مار اور محنت کشوں کے لئے محرومی کی سرزمین ہے۔

غریب ترین عوام پر جنگ مسلط کرنا ہو یا بیرونی حکومتوں یا کارپوریشنوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار کرنا ہو، ہندوستان کی ہر حکومت نے محنت کشوں کو دھوکے دیئے ہیں۔ انہوں نے وال سٹریٹ اور دوسرے سرمایہ داروں کے ساتھ خفیہ معاہدے کئے ہیں جبکہ نسبتاً خوشحال مڈل کلاس کے سامنے آزادی اور خودمختاری کا ڈھونگ رچاتے ہیں جو اس پر یقین بھی کرتے ہیں اور ملک کے غریبوں پر ہونے والے جبر کو 'ضروری معاشی انفراسٹرکچر' حاصل کرنے کی قیمت قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان کے کارپوریٹ سرمایہ دار طبقات نے ہندو بنیاد پرستوں کو اقتدار میں پہنچایا ہے۔ یہ حقیقت خود ''آزادی'' کے بعد سماج پر مسلط ہونے والے حکمران طبقات کی رجعتی فطرت کی عکاس ہے۔ کانگریس اور اپوزیشن کی دوسری پارٹیوں کے پاس کوئی متبادل نہیں ہے۔ جمہوریت اور سیکولرازم کے نعروں میں محنت کشوں کے لئے کوئی کشش نہیں ہے۔

طلبہ تحریک

ہندوستان میں 65 فیصد آبادی 35 سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے اور ایک سروے کے مطابق 2020ء تک ہندوستان دنیا کا سب سے نوجوان ملک بن جائے گا جس کی اوسط عمر 29 سال ہوگی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کی حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی محنت کشوں کے

ساتھ ساتھ نوجوانوں پر معاشی حملے شروع کر دیئے تھے تا کہ سرمایہ داروں کی بلند شرح منافع کو یقینی بنانے کے لئے موزوں حالات پیدا کئے جاسکیں۔ 2014-15ء کے بجٹ میں تعلیم کے ریاستی اخراجات میں 24.68 فیصد کٹوتی کی گئی، یعنی یہ اخراجات 82,771 کروڑ روپے سے 69,074 کروڑ کر دیئے گئے۔ 2016ء کی شروعات میں ہی فیسوں میں اضافہ کر دیا گیا، پنجاب یونیورسٹی (ہندوستان) کی فیسوں میں 5 فیصد اضافہ کیا گیا ہے، آئی ٹی کی فیسوں میں 3 گنا اضافہ کیا گیا ہے جو سالانہ 90 ہزار روپے سے بڑھا کر 3 لاکھ روپے کر دی گئی، IPU کالجز کی فیسوں میں 24 فیصد اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح ہر سطح پر ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کی فیسوں میں مختلف شرح سے اضافہ کیا گیا۔ جہاں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھی 58 فیصد آبادی تین ڈالر یومیہ پر زندگی گزار رہی ہو وہاں پر ایسے حالات میں نوجوانوں کے وسیع حصے کے لئے تعلیم حاصل کرنا نہایت ہی مشکل ہو جاتا ہے، اور جو تعلیم دی جاتی ہے وہ بھی معیاری نہیں ہوتی، وسیع بیروزگاری کی لعنت اس کے علاوہ ہے۔

نہایت مشکل حالت میں اگر کوئی ڈگری حاصل کر بھی لے تو یونیورسٹی سے نکل کر روزگار کے تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ والدین جو انتہائی تنگ معاشی حالات میں بچوں کی تعلیم پر خرچہ کرتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ خرچہ منافع کے ساتھ ان کا بچہ واپس کرے گا، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے بحران کی موجودہ کیفیت میں ان کا یہ خواب صرف خواب ہی رہ جاتا ہے کیونکہ روزگار کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں اور دنیا بھر میں یہی حالات ہیں۔ ہندوستان میں بیروزگاری کی شرح کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جب ستمبر 2015ء میں اتر پردیش کی حکومت نے کچھ سرکاری آسامیوں کا اعلان کیا تو چپڑاسی کی ایک سیٹ کے لئے 24 لاکھ امیدواروں نے درخواست دی تھی جس میں پی ایچ ڈی سمیت اعلیٰ ڈگریاں رکھنے والے سینکڑوں نوجوان شامل تھے۔ NDTV کے ایک سروے کے مطابق ہندوستان کے 67 فیصد بے روزگار نوجوانوں میں سے 50 فیصد ڈگری یافتہ ہیں۔ ہر سال 50 لاکھ نوجوان تعلیمی اداروں سے ڈگری لے کر محنت کی منڈی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس تعداد کے مقابلے میں روزگار کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہندوستان

میں نوجوان نسل میں خودکشیوں کے بڑھتے ہوئے رجحان کی ایک وجہ بیروزگاری بھی ہے۔ بنگلور جو کہ ہندوستان کے آئی ٹی سیکٹر کا گڑھ سمجھا جاتا ہے یہاں خودکشیوں کی شرح سب سے زیادہ ہے جس کی وجوہات میں سماجی بیگانگی، مسلسل عدم استحکام کی کیفیت اور بیروزگاری شامل ہیں۔ خاندان اور معاشرے کے دباؤ سے نوجوانوں کی بڑی تعداد نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو تی جارہی ہے۔ ایک سروے کے مطابق نفسیاتی مریضوں کی کل تعداد کا 15 فیصد نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ یہ ڈپریشن اور دوسری نفسیاتی بیماریاں نہ صرف خودکشی بلکہ سماج دشمن رویوں، بنیاد پرستانہ مذہبیت، جرائم اور منشیات کی طرف بھی نوجوانوں کو دھکیل دیتی ہیں۔ RSS اور ABVP جیسی ہندو انتہا پسند تنظیموں کے ذریعے تعلیمی اداروں میں غنڈہ گردی کی جارہی ہے اور ترقی پسند نظریات کے مقابلے میں فسطائی رجحانات کو ابھارنے کی کوشش مسلسل جاری ہے۔ یہ سب کچھ ''سیکولر ریاست'' کی چھتری تلے ہورہا ہے تاکہ طلبہ کو ان کے حقیقی مسائل اور طبقاتی سیاست سے دور کرکے نان ایشوز، انتہا پسندی اور لمپن ازم میں غرق کیا جاسکے۔ جہاں کہیں بھی طلبہ اپنے حق کے لئے آواز اٹھاتے ہیں تو ریاست غنڈہ گردی کے ذریعے انہیں دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ ریاستی جبر کے علاوہ کارپوریٹ میڈیا کو استعمال کرکے ایسی طلبہ تحریکوں کو خوب بدنام کیا جاتا ہے اور پروپیگنڈا کرکے دوسرے اداروں کے طلبہ اور نوجوانوں میں خوف پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن حکمرانوں کے ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود طلبہ نے نہ صرف ریاستی جبر کا مقابلہ کیا ہے بلکہ اسے شکست بھی دی ہے۔ Occupy UGC تحریک کے بعد جواہر لال نہرو یونیورسٹی (JNU) میں طلبہ کے شاندار جدوجہد کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پچھلے عرصے میں بائیں بازو کی پارٹیوں کی سرکار سے لڑائی بڑھ گئی ہے۔ بہت سے تجزیہ نگار مودی سرکار کے جبر کو 1974ء کے بعد اندرا گاندھی کی ایمرجنسی سے تشبیہہ دے رہے ہیں جس میں بنیادی حقوق معطل کردیئے گئے تھے اور ہر مخالف کو کچلنے کی پالیسی اپنائی گئی تھی۔ اس وقت محنت کشوں اور نوجوانوں کی بغاوت نے اندرا گاندھی کا تختہ الٹ دیا تھا۔

کشمیر

کشمیر میں ہندوستان کے حکمرانوں کے جبر کے خلاف نفرت اور حقارت کا اظہار ایک مرتبہ پھر عوام کی سرکشی میں ہوا ہے۔ مسئلہ کشمیر برصغیر کے بٹوارے کا رستا ہوا زخم اور ایسا تنازعہ ہے جسے برطانوی سامراج نے خطے میں عدم استحکام جاری رکھنے کے لیے اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔ برصغیر کے نئے حکمران 'تقسیم کرو اور حکمرانی کرو' کی پالیسی، جسے برطانوی سامراج نے قدیم روم کے بادشاہوں سے سیکھا تھا، کے ذریعے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہ مفلوج اور تاریخی طور پر تاخیر زدہ سرمایہ دارانہ ریاستیں، جنہیں برطانوی سامراج نے مقامی گماشتہ حکمران طبقات کے ساتھ ساز باز کر کے تخلیق کیا تھا، کشمیر اور دوسرے خطوں میں عوام کی مزاحمت کو کچلنے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں جب ہندوستان کی فوج نے حزب المجاہدین کے کمانڈر برہان مظفر وانی کو مار دینے کا اعلان کیا تو اس کے چند گھنٹے بعد ہی کشمیری عوام سڑکوں پر امڈ آئے۔ یہ بھارتی ریاست کے جبر سے آزادی کے لیے جدوجہد کی نئی کروٹ ہے۔ وانی وادی کشمیر میں مسلح لڑائی کے لیے بھرتی کرنے اور اس کی ترغیب دینے والوں کی صف اول میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا تعلق 2010ء کے عوامی مظاہروں کے بعد مسلح جدوجہد میں شمولیت اختیار کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نئی نسل سے تھا۔ ہندوستانی ریاست نے اس کی موت کو کامیاب دہشت گردی مخالف آپریشن قرار دیا جبکہ عام کشمیریوں نے برہان وانی اور جے کے ایل ایف کے اشفاق مجید وانی، جو 1990ء کی دہائی کی مسلح جدوجہد کا مشہور شہید ہے، کی حمایت میں مظاہرے شروع کر دیئے۔

ٹائمز آف انڈیا کے ایک آرٹیکل کے مطابق، ''رویوں میں اس طرح کی قلابازی تمام جنگ زدہ علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ 'آزادی' کے لیے ہونے والے تشدد اور ساتھ ہی ہندوستان اور پاکستان کی جانب سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہونے والی سازشیں کشمیر میں دیومالائی کہانیوں کے لیے زرخیز زمین مہیا کرتی ہے''۔ ایک فوجی افسر کی بات کو نقل کرتے ہوئے اخبار لکھتا ہے، ''برہان کوئی مسلح جنگجو نہیں تھا۔ میرے خیال میں ہم پاکستان کی چال کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے ہم سے برہان کے ذریعے کشمیر کی آئندہ نسلوں کے لیے ایک ہیرو بنوایا۔ وہ کامیاب ہو گئے۔

کشمیر میں ہر قتل ایک قالب کی مانند ہے جو بڑا ہو کر پیچیدہ اور کسی اور چیز میں بدل جاتا ہے، اتنی تیزی سے کہ حقیقت کو افسانے سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے''۔

ہندوستانی ریاست اور انٹیلی جنس ماہرین نے اس قتل کے ردعمل کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ انہیں شدید عوامی ردعمل، روزانہ احتجاجی مظاہروں اور درجنوں ہلاکتوں کی توقع نہیں تھی۔ جھڑپوں میں اب تک تقریباً سو لوگ مارے گئے ہیں اور ہسپتالوں میں سینکڑوں زخمی موجود ہیں جن میں سے کئی بری طرح زخمی ہیں یا معذور ہو چکے ہیں۔ پورے ہفتے تقریباً ہر دن نوجوان مظاہرین کی مزاحمت دیکھنے میں آئی جو کرفیو کی پروا کیے بغیر ہندوستانی فوجوں کی گولیوں اور آنسو گیس کا مقابلہ کرتے رہے۔ سرکار پریشان ہے کہ انہوں نے نا سمجھی میں ایک ایسی بغاوت کو بھڑکا دیا ہے جسے وہ قابو نہیں پا رہے۔ مسلح جدوجہد کے خلاف آپریشن میں مصروف ایک اعلیٰ سکیورٹی افسر نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر اے ایف پی کو بتایا ''ہمیں اس طرح کے عوامی ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ یہ پریشان کن ہے''۔ حکام نے چوبیس گھنٹے کے لیے کرفیو لگایا لیکن مظاہرین نے فوجی اور نیم فوجی تنصیبات پر حملے کیے، کئی پولیس سٹیشنوں کو آگ لگائی اور پولیس اور ہندوستان کے حمایتی سیاست دانوں کے گھر جلا دیئے۔

اجوئے گوش نے لکھا ہے، ''جنوب کے کئی علاقوں میں انتظامیہ غائب ہو گئی ہے۔ محبوبہ مفتی کی حکومت عملی طور پر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکی ہے اور مرکزی فورسز کہیں نظر نہیں آتیں، ایسا لگتا ہے کہ ریاست نے جنوبی کشمیر کے بڑے حصوں کو آزادی دے دی ہے۔ شمالی علاقوں، جہاں فوج اور نیم فوجی فورسز کی تعیناتی زیادہ ہے، میں کسی حد تک مرکزی اتھارٹی کی موجودگی کا شائبہ ملتا ہے لیکن یہاں بھی مقامی پولیس اور سول انتظامیہ کی غیر موجودگی واضح نظر آتی ہے۔ جموں و کشمیر پولیس عملی طور پر وادی سے غائب ہو چکی ہے۔ وزرا اور پی ڈی پی اور بی جے پی سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی وادی میں آزادانہ نقل و حرکت کی جرات نہیں کرتے۔ بی جے پی کے بہت سے ارکان اسمبلی جموں میں اپنے گھروں تک محدود ہو گئے ہیں جبکہ پی ڈی پی کے ارکان اسمبلی سری نگر میں اپنی سرکاری رہائش گاہوں میں سخت پہروں میں رہ رہے ہیں۔ پی ڈی پی کے اکثر ارکان اسمبلی، بشمول وزیر اعلیٰ، اپنے حلقوں میں جانے سے خوفزدہ ہیں''۔

وانی کے اس قتل کے خلاف عوامی ردعمل کا شدید دباو ہندوستان کی اسٹیبلشمنٹ اور بی جے پی کی حکومت پر پڑ رہا ہے۔ وزیراعظم نریندر امودی نے چار ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد واپسی پر فوراً ایک اعلیٰ سطحی اجلاس بلایا تا کہ 'امن وامان' کی صورتحال پر بحث کی جائے۔ کشمیر کے سابقہ وزیراعلیٰ، جو پچھلی بی جے پی حکومت کا اتحادی اور وفاقی وزیر تھا، نے وانی کی موت کے بعد ٹویٹ کیا کہ وہ ''کشمیر کے باغیوں کے لیے نیا ہیرو بن چکا ہے''۔ حکومت نے وادی میں دو ہزار افراد پر مشتمل مزید نیم فوجی دستے بھیجے ہیں جہاں پہلے سے ہی پانچ لاکھ فوجی مستقل طور پر تعینات ہیں۔ پچھلے ستر سالوں میں کشمیر کے دونوں اطراف کے محنت کش اور نوجوان برصغیر کے دوسرے محکوم عوام، بالخصوص محکوم قومیتوں کی طرح اس جابر سماجی اور معاشی نظام کے ظلم و استحصال کا شکار بنتے چلے آ رہے ہیں۔ بٹوارے کے بعد کشمیر دو ایٹمی طاقتوں کے بیچ تنازعے کی اہم وجہ رہی ہے (اور بنائی بھی گئی ہے) جو دنیا میں اسلحے پر سب سے زیادہ لیکن صحت اور تعلیم پر سب سے کم خرچ کرنے والوں میں شامل ہیں۔ کشمیر کے عوام نہ صرف سرمایہ دارانہ ریاستوں کے جبر سے دوچار ہیں بلکہ حکمرانوں کے مختلف دھڑوں سے منسلک کشمیری لیڈروں کی غداریوں کو بھی سہتے آئے ہیں۔

پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں فوج کی تعیناتی اور ایک وزارت اور ریاستی ایجنسیوں کے ذریعے جابرانہ حکومت 'آزاد کشمیر' کے عوام کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ دوسری طرف ہندوستان کی فوج نہ صرف تحریک کو کچلنے میں ناکام ہوئی ہے بلکہ جدوجہد کا انقلابی جذبہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہو گیا ہے۔ پاکستان کے زیر تسلط علاقوں سے بہت سے کشمیری نوجوان پاکستان، برطانیہ، یورپ اور مشرق وسطیٰ میں روزگار کی تلاش میں دربدر ہونے پر مجبور ہیں۔ ان کی حالت زار ایک اور المناک داستان ہے۔

پچھلی سات دہائیوں کے جبر اور جارحیت کے دوران تحریک میں کئی اتار چڑھاو آئے ہیں۔ انفرادی دہشت گردی کا طریقہ کار الٹا نقصان دہ ثابت ہوا ہے اور اس سے جابر ریاستوں کو جبر کرنے کا جواز فراہم ہوتا ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی کی 'سپانسرڈ' مداخلت سے ہندوستان کی ریاست کو عام کشمیریوں پر جبر کرنے کا موقع ملا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے قومی آزادی کی تحریک کا

تشخص مجروح ہوتا ہے اور یہ مذہبی انتہاپسند عام کشمیریوں پر جبر کرنے میں کسی طرح کم نہیں ہے۔انفرادی دہشت گردی اور مسلح جدوجہد کشمیری عوام کو آزادی دلانے میں ناکام ہوئی ہے اور 'مذاکرات' کی حیثیت کسی ناٹک سے زیادہ کچھ نہیں رہی۔اقوام متحدہ اور سامراج کے گماشتہ دوسرے نام نہاد عالمی ادارے فلسطین کی طرح اس وادی کے عام باسیوں کے لیے بے کار ہی ثابت ہوئے ہیں۔لیکن اس جدوجہد نے کئی عوامی تحریکیں دیکھی ہیں جیسا کہ 1987ء کی تحریک، جس نے ہندوستانی ریاست کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ 2010ء کی تحریک قوم پرستی پر مبنی آزادی سے زیادہ سماجی و معاشی آزادی کی طرف مائل تھی۔تحریکوں کے پھٹنے کی فوری وجہ کوئی چھوٹا سا واقعہ ہوسکتا ہے لیکن مسلسل سماجی بے چینی اور بیزاری کی کیفیت میں حکمران ریاستیں کوئی مستحکم اقتدار کشمیر میں قائم نہیں کرسکتیں۔

2016ء کی سرکشی کئی حوالوں سے 1990ء کی بغاوت سے مختلف ہے۔پہلی صفوں پر موجود کشمیریوں کی نئی نسل زیادہ جرات منداور باغی ہے۔ان کے اندر ایک نئی جرات، تڑپ اور اعتماد ہے۔کشمیر میں نوجوانوں کی نئی نسل قومی آزادی کو سماجی و معاشی آزادی کے ساتھ جوڑتی ہے۔ ان نوجوانوں کی یہ آرزوئیں برصغیر کی بوسیدہ سرمایہ دارانہ ریاستوں میں کہیں بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتیں۔اس لیے کشمیری عوام کی یہ شاندار جدوجہد اور قربانیاں پورے خطے کے محکوم عوام، بالخصوص نوجوانوں پر بڑے اثرات مرتب کررہی ہیں۔ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر کشمیر کی موجودہ تحریک طبقاتی جدوجہد پر مبنی وسیع بغاوت میں بدل سکتی ہے جس میں ابتدائی طور پر نوجوان پہلی صف میں ہوں گے۔

کشمیر میں مزید عوامی تحریکیں ابھریں گی۔لیکن معاشی، سماجی اور قومی آزادی کے لیے ان تحریکوں کو باقی ماندہ برصغیر میں وسیع تر عوام کی طبقاتی جدوجہد سے جڑنا ہوگا۔طبقاتی جدوجہد پر مبنی یہی انقلابی تحریک کشمیر کو جابر ریاستوں اور ان کے نظام کے تسلط سے آزاد کرسکتی ہے جو نہ صرف کشمیر بلکہ پورے خطے کے ڈیڑھ ارب انسانوں کی زندگیوں کو عذاب مسلسل بنائے ہوئے ہیں۔ کشمیری نوجوان اور محنت کش سوشلسٹ تناظر اور لائحہ عمل کے ساتھ ایسی انقلابی تحریک بھڑکا سکتے ہیں جو پورے جنوب ایشیا کو سرخ لڑی میں پروئے گی۔

سامراج اور خارجہ پالیسی

افغانستان میں مودی کی ایک ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا اعلان اور ہند افغان سلما ڈیم کا افتتاح ہندوستان کے حکمران طبقات کے سامراجی عزائم کی عکاسی کرتا ہے۔ حالیہ سالوں میں ہندوستان امریکہ کے قریب تر آ گیا ہے اور نتیجتاً اس کی جیو پولیٹکل اور معاشی بالادستی کو قبول کر رہا ہے۔ امریکہ کی ہندوستان کی ایٹمی انڈسٹری کی منظوری اور اس کی ترویج (باوجود اس کے کہ ہندوستان نے ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط نہیں کیا ہے) کے بدلے ہندوستان کی معیشت کو مغربی کمپنیوں، ایگری بزنس، دواساز کمپنیوں اور دوسرے کاروباروں کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ مودی نے چین کے ساتھ 22 ارب ڈالر کے 26 معاہدے طے کئے۔ اس سے قبل ستمبر 2014ء میں چینی صدر شی جن پنگ کے دورہ ہندوستان کے دوران 20 ارب ڈالر کے منصوبوں پر دستخط ہوئے تھے۔ کل ملا کر بھارت چین تجارتی معاہدوں کی مالیت 42 ارب ڈالر بنتی ہے۔

نریندرا مودی کا دورہ سعودی عرب انتہائی دلچسپ تھا۔ اُدھر کے کٹر اور پرہیزگار وہابی شہنشاہوں نے ''نیکی کے اس فرشتے'' کا نہ صرف تاریخی پرتپاک استقبال کیا بلکہ ان شریفین حرم نے سعودی عرب کی بادشاہت پر مبنی ریاست کا سب سے بڑا ایوارڈ اور اعزاز بھی اس ہندو مت کے بنیاد پرست حکمران کی نذر کیا۔ اس کے بعد مودی نے ابوظہبی اور متحدہ عرب امارات میں انتہائی شان و شوکت سے بھرپور استقبال کروایا، تماشا یہ رہا کہ 'امت مسلمہ' کے نگہبانوں سے ان کی 'اسلامی مملکت' کے پہلے 'مندر' کا سنگ بنیاد رکھوایا گیا۔ پھر مودی نے ایران کا غیر معمولی دورہ کیا۔ آیت اللہ خامنائی سے بے پناہ گرم جوشی سے ملاقات ہوئی۔ ایران، افغانستان اور ہندوستان کے درمیان 'چابہار' کی بندرگاہ کی وسیع پیمانے پر تعمیر اور دوسرے تجارتی روٹس کا معاہدہ ہوا۔ مودی نے اس بندرگاہ کو تعمیر کرنے کے تمام اخراجات ہندوستان کے ذمہ لئے ہیں۔

'چابہار'، گوادر سے صرف چند سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ چین نے گوادر پورٹ کی تعمیر کے

ٹھیکہ جات حاصل کر رکھے ہیں اور اب ہندوستان نے 'چابہار' بنانے کا ٹھیکہ حاصل کر لیا ہے۔ اس کے پیچھے ہندوستان کے حکمران طبقات کے مالیاتی اور منافع خوری کے مفادات اور بھارتی ریاست کے سامراجی عزائم کی حکمت عملی ہے۔

'چابہار' کی بندرگاہ پر بھارتی حکمرانوں کی بہت عرصے سے نظر تھی۔ ہندوستان کے مغربی ساحل کی بندرگاہ 'کانڈالہ' اور 'چابہار' کے درمیان فاصلہ دہلی اور ممبئی کی دوری سے بھی کم ہے۔ اقتصادی حوالے سے ہندوستان، افغانستان، وسط ایشیا اور روس سے تجارت کے لئے یہ ایک منافع بخش روٹ ہے۔ لیکن یہاں سے اہم جنس، جس کی تجارت ہوگی وہ تیل ہے۔ اس وقت چین، ایران سے تیل خریدنے والا سب سے بڑا ملک ہے، دوسرا نمبر ہندوستان کا ہے۔ مودی نے معاہدے کے بعد اپنے خطاب میں کہا ''افغانستان کو ایک دوستانہ اور بامعنی روٹ ملے گا جس کی بنیاد پر وہ باقی دنیا سے بہتر تجارت کر سکے گا''۔ مودی سرکار کی طرف سے ایران کو 150 ملین ڈالر کی پہلی قسط سے اس بندرگاہ کی وسعت اور صنعتی زون کی تعمیر کا آغاز ہوگا۔ اس زون میں بھارتی اجارہ داریاں اور سرمایہ دار کم داموں سے زیادہ منافع خوری کے عزائم رکھتے ہیں۔ ہندوستان اس سستے تیل سے اپنی معاشی ترقی کو چلتے رکھنا چاہتا ہے، جس سے بالادست طبقات اور بی جے پی کی حمایت کرنے والی زیادہ تر مڈل کلاس میں 'وسعت' لانے کے عزائم ہیں۔

ہندوستان کو ایران پر مغربی پابندیوں کے باوجود امریکہ نے تیل درآمد کرنے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن مسئلہ ان پابندیوں کی وجہ سے بینکوں میں رقوم کی منتقلی کی رکاوٹوں کا تھا۔ ایران پر پابندیوں کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی ریفائنریوں کے مالکان نے ایران کو واجب الادا 6.4 ارب ڈالر فوراً دے دیئے، کیونکہ اب بھارتی سرمایہ دار طبقے کے لئے ایران کی منڈی پر جھپٹنے کے راستے کھل گئے تھے۔ اگر ہم سعودی عرب اور خلیجی بادشاہتوں کی اس ہندو بنیاد پرست (مودی) کے لیے اعزازات اور عزت افزائی کی انتہاؤں کا جائزہ لیں تو اس کے پیچھے بھی کاروباری مفادات ہی ہیں۔ سعودی عرب نے تیل کی قیمتوں کو اس لیے گرایا تھا کہ امریکہ میں شیل آئل کی پہلے سے مہنگی پیداوار کو روکا جا سکے کیونکہ ایسے میں شیل ٹیکنالوجی سے تیل نکالنے والی کمپنیاں منافع نہ ہونے پر دیوالیہ ہو جائیں گی۔ اس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ لیکن دوسری جانب نئی

سعودی حاکمیت کا یہ منصوبہ کہ تیل سے ہٹ کر دوسری بنیادوں پر معیشت کو استوار کیا جائے، محض خودفریبی ہے۔ وجہ بالکل واضح ہے، عالمی سرمایہ داری کے بحران میں جہاں ترقی یافتہ معیشتیں بحال ہونے میں ناکام رہی ہیں وہاں سعودی عرب کی معیشت کیسے صنعتی اور 'خدمات کے شعبے' (سروسز) کے پھیلاؤ سے ابھر سکتی ہے۔ اس لئے ان کو سستا تیل بیچ کر ہی گزارہ کرنا پڑے گا، لیکن جس طرح بحران سنگین ہو گیا ہے اس سے نکلنا ممکن نہیں ہوگا۔ ایران کے ملاؤں کے ہندوستان کے ساتھ اس گہرے یارانے کے ناٹک کا مقصد بھی کاروباری ہے۔

خونی انتشار اور دہشت گردی سے بھرے افغانستان میں سے تجارت کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا جیسا اس معاہدے میں بتایا جا رہا ہے۔ مودی کی ایک دوسرے سے متحارب سعودی اور ایرانی حکمرانوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں عیارانہ سفارتکاری، معاہدے اور معاشی بندھنوں کی داغ بیل کی کوششیں، انکی دوستی اور دشمنیوں کی حقیقت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ سرمائے کے ان نمائندہ حکمرانوں کا طرز اقتدار چاہے جمہوری ہو یا بادشاہت پر مبنی ہو، آمرانہ ہو یا پھر اسلامی یا ہندو مذہب کے نام پر آمریت کا حامل ہو، سب کے سب آخری تجزیے میں مالیاتی سرمائے کے مطیع اور اسکے احکامات و مفادات کے تابع اور کارندے ہوتے ہیں۔

یہ حاکمیتیں سرمایہ دارانہ نظام کے ایسے دور میں برسر اقتدار ہیں جہاں اس نظام کی تنزلی سے ابھرنے والا سماجی بحران ان کے اقتدار کے لئے مسلسل خطرہ بنا رہتا ہے۔ دوسری جانب جن سرمایہ داروں اور کارپوریٹ اجارہ داریوں کی دولت سے ہندوستان میں الیکشن جیتے اور اقتدار حاصل کیے جاتے ہیں وہ پھر اپنے پیسے کا حساب ان پالیسیوں کی صورت میں مانگتے ہیں جن سے ان بحرانی کیفیات سے نکلنے کے لیے نئی منڈیاں، استحصالی پراجیکٹ، تجارتی راستے اور معاہدے حاصل ہو سکیں۔ ماضی قریب کی ہی بات ہے، یہی بھارت کا کاروباری حکمران طبقہ کانگریس کو اقتدار دلوایا کرتا تھا، لیکن جب اس کو اپنی شرح منافع کے لیے جبر کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے سارے داؤ مودی سرکار بنانے پر لگا دیئے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا اور ہندومت کی جنونیت اور وحشت کے ذریعے مودی کو اقتدار دلوایا۔

محنت کش طبقے کی تحریک اور تناظر

2 ستمبر 2016ء کی عام ہڑتال (''بھارت بند'') اس خطے کی تاریخ کی سب سے بڑی ہڑتال تھی جو محروم و مجبور طبقات کی اس نظام کے خلاف جدوجہد کی روایت کا ایک اور تسلسل تھا۔ الجزیرہ کے مطابق اس ہڑتال میں 18 کروڑ محنت کشوں نے حصہ لیا جن میں سٹیٹ بینک کے ملازمین، نرسز، اساتذہ، ڈاک کے محنت کش، کان کن اور تعمیرات کے مزدور شامل تھے۔ کچھ ٹریڈ یونین اور کمیونسٹ پارٹی کے کارکنان کے مطابق یہ تعداد 20 کروڑ تھی جو کم و بیش پاکستان کی کل آبادی کے برابر ہے۔ گزشتہ برس 2 ستمبر کی عام ہڑتال میں 15 کروڑ محنت کش شریک ہوئے تھے۔

نیچے سے عام محنت کشوں کے بے پناہ دباؤ کی وجہ سے ٹریڈ یونینز کی قیادتوں نے ہڑتال کی کال واپس لینے سے انکار کر دیا تھا، اگرچہ آخری لمحات پر حکومت کم از اجرت میں اضافے سمیت کچھ مطالبات ماننے پر تیار ہو چکی تھی۔ بی جے پی کی ماخذ تنظیم 'راشٹریا سوئم سیوک سنگھ' سے جڑی بڑی یونین بھارتیہ مزدور سنگ نے ہڑتال کی مخالفت کی اور اب انہیں کم از کم محنت کشوں کی باشعور پرتوں کے غصے اور نفرت کا سامنا کرنا ہوگا۔ وزیر خزانہ ارون جیٹلی کے ساتھ مذاکرات ناکام ہونے پر سی آئی ٹی یو، اے آئی ٹی یو سی، آئی این ٹی یو سی، ایچ ایم ایس اور چھ دوسری بڑی ٹریڈ یونین تنظیموں نے اس ہڑتال کی کال دے دی۔ یونین لیڈروں نے وزیر کی جانب سے غیر ہنر مند محنت کش کی کم از اجرت 6396 روپے سے بڑھا کر 9100 روپے کرنے کی پیشکش رد کر دی تھی۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق محنت کشوں کے مطالبات میں پیداوار نہ دینے والے کارخانوں کو بند کرنے کے حکومتی منصوبوں، کچھ صنعتوں میں بیرونی سرمایہ کاری کی حد میں اضافے (نجکاری کی ایک شکل) اور سرکاری کمپنیوں کے شیئرز کی فروخت کے حکومتی منصوبوں کا خاتمہ سرفہرست تھا۔ یونینز کے مطابق حکومت کو سب کے لیے سوشل سکیورٹی اور صحت کی سہولیات کی فراہمی کی ضمانت اور کم از کم اجرت کو دوگنا کرنا چاہیے۔

ہندوستان کے کارپوریٹ میڈیا کے مطابق نئی دہلی اور ممبئی جیسے بڑے شہروں میں بجلی و پانی

جیسی بنیادی سہولیات کی فراہمی متاثر نہیں ہوئی۔لیکن دہلی کی حالیہ تاریخ میں نرسوں کا سب سے بڑا احتجاجی مظاہر ہوا جس میں بیس ہزار افراد نے صفدر جنگ ہسپتال سے جلوس نکالا۔ ہڑتال کی قوت اور پھلاؤ کا یہ عالم تھا کہ ریاستی جبر اور خونریزی کے باوجود جموں اور کشمیر میں ہڑتال تھی اور سی آئی ٹی یو جموں کشمیر کے صدر یوسف تاریگامی نے جموں شہر میں ایک بہت بڑے جلوس کی قیادت کی۔

2008ء میں منظم شعبے میں محنت کشوں کی تعداد 2 کروڑ 75 لاکھ تھی جن میں 1 کروڑ 73 لاکھ سرکاری اداروں میں ملازم تھے۔ان محنت کشوں کے سر پر نجکاری کی تلوار لٹک رہی ہے کیونکہ مودی نے اپنے 'جمہوری' چناؤ پر اربوں روپے خرچ کرنے والے سرمایہ داروں سے ان لیبر مخالف پالیسیوں (''اصلاحات'') کا وعدہ کر رکھا ہے۔لیکن یہ مالکان اور سامراجی مودی سرکار کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں کیونکہ محنت کشوں کی جدوجہد اور حالیہ اور گزشتہ برس کی عام ہڑتال کے سامنے یہ نام نہاد اصلاحات سست پڑ چکی ہیں۔موجودہ ہڑتال سے مودی سرکار کا تذبذب اور بھی بڑھ جائے گا اور اس کا نیولبرل ایجنڈا مزید سست روی کا شکار ہوگا۔

افرادی قوت اور شمولیت کے لحاظ سے یہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی عام ہڑتال تھی تاہم اس ہڑتال کی کامیابی کا یہ مطلب نہیں محنت کشوں کے مطالبات تسلیم ہو جائیں گے۔سرمایہ داری جس بحران سے عالمی سطح پر دوچار ہے اس میں حکمران طبقات کے پاس محنت کشوں پر حملوں کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔دوسری طرف محنت کش طبقے کی برداشت بھی جواب دیتی جا رہی ہے۔یہ طبقاتی جدوجہد کے دھماکہ خیز انداز میں پھٹنے کا مکمل نسخہ ہے۔ہڑتال کے بعد زندگی پھر اسی تکلیف دہ معمول کی جانب لوٹ چکی ہے لیکن یہ معمول پچھلے سال سے مختلف ہے۔باشعور نوجوانوں اور محنت کشوں کے بڑے حصے جدوجہد جاری رکھنا چاہتے ہیں اور سال کے سال عام ہڑتال اور بیچ کے وقفے میں تلخ زندگیوں میں کوئی بھی بہتری نہ آنے کے معمول کو توڑنا چاہتے ہیں۔

روزنامہ 'دی ہندو' کے مطابق ''محنت کشوں کی 14 تنظیموں اور فیڈریشنوں نے مزدور ادھیکار سنگھرش ابھیان کے نام سے (پورے ملک کے محنت کشوں کی نمائندگی کرنے والی) 'سی ٹی یو او تنظیموں' کے متبادل نیا پلیٹ فارم کھڑا کیا ہے''۔اس کے کوآرڈینیٹر امیتاو بھٹاچاریہ نے کہا کہ ''لبرلائیزیشن کے 25 برسوں کے دوران سی ٹی یو او تنظیمیں مضبوط لیبر تحریک بنانے اور محنت کشوں

کے حقوق کے تحفظ میں ناکام ہو چکی ہیں... پچھلے سال بھی عام ہڑتال ہوئی تھی اور اس سے پہلے بھی یہ ہوتی رہی ہیں۔ کیا مزدوروں کے حالات میں کوئی بہتری آئی ہے؟ سی ٹی یو او تنظیموں نے محنت کشوں کے مفادات کو بار بار کمزور کیا ہے اور کارپوریٹ نواز ریاست سے سمجھوتے کیے ہیں۔ اسی لیے ہم نے یہ قدم اٹھایا ہے''۔ اس نئی تنظیم نے بھی اس ہڑتال میں حصہ لیا اور اسے اپنے سال بھر کے کام کا آغاز قرار دیا۔

آج نئے عہد میں محنت کش طبقہ اور اس کی تحریکیں سماجی اور معاشی نظام کی تبدیلی کے لیے متحرک ہو رہی ہیں۔ مارکسزم کے نظریات اور انقلابی سوشلزم کے پروگرام سے لیس ایک سیاسی قوت ہی یہ فریضہ ادا کر سکتی ہے۔ اس عام ہڑتال نے ایک مرتبہ پھر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت کے سامنے تاریخ کا چیلنج رکھ دیا ہے۔ اس تاریخی فریضے میں ناکامی کی سزا بہت سخت ہو گی۔ ان روایتی قیادتوں کے پاس کھونے کو صرف پارلیمانی سیاست اور اصلاح پسندی کی زنجیریں ہیں جبکہ ہندوستان کے ایک ارب سے زائد محنت کش عوام کے پانے کو پورا جہاں ہے۔

سابقہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مایوس و بدگمان تمام نام نہاد 'کمیونسٹ'، 'سوشلسٹ' اور لبرل تجزیہ نگار جو ہندوستان کے محنت کش طبقے کی طاقت کو رد کر چکے تھے، انہیں محنت کشوں کی ہڑتال میں اتنی بڑی تعداد کی شرکت اور شدت نے رد کر دیا۔ اس تاریخی روز ایک جرات اور دلیری کی لہر پورے ہندوستان میں موجود تھی۔ اسی باعث انتہائی دائیں بازو کے ٹی وی چینلوں اور اخبارات کو ہڑتال کی شاندار کامیابی کو تسلیم کرنا پڑا۔ درحقیقت اس ہڑتال نے ہندوستان کے بڑے دانشوروں اور ماہرین پر سکتہ طاری کر دیا۔

لیکن اس ہڑتال کا سب سے کلیدی پہلو محنت کشوں کا قیادت پر ایک لمبے عرصے سے بڑھنے والا مسلسل دباؤ تھا۔ فروری 2014ء میں بھی کانگریس حکومت کے خلاف دو روزہ عام ہڑتال کی گئی تھی جس میں دس کروڑ افراد نے شرکت کی تھی۔ اس ہڑتال میں بی جے پی کی حمایت یافتہ یونین بھی شامل تھی۔ لیکن بھارتیہ مزدور سنگھ کی عین موقع پر غداری کے باوجود ہڑتال میں اٹھارہ کروڑ افراد کی شرکت محنت کشوں میں موجود غم و غصے کا پتہ دیتی ہے۔ ٹریڈ یونین کے راہنماؤں کو بھی نیچے سے ابھرنے والے دباؤ کو راستہ دینا پڑا اور وہ ہڑتال کی کال دینے پر مجبور ہوئے۔ اگر وہ اس دباؤ

کے باوجود ہڑتال کی کال نہ دیتے تو خود ان کی قیادت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

ہندو بنیاد پرست مودی کی مئی 2015ء میں کامیابی اور پارلیمنٹ میں فیصلہ کن اکثریت کے بعد ''اصلاحات'' کے ایک سلسلے کا آغاز کیا تا کہ سرمایہ داروں کے منافعوں میں مزید اضافہ کیا جا سکے۔ لیکن اتنی بڑی کامیابی اور سرمایہ داروں کی مکمل حمایت کے باوجود مودی کو اپنے ایجنڈے پر عملدرآمد میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ ہندو بنیاد پرستوں کی حمایت ہونے کے باوجود مودی پر محنت کش عوام کا شدید دباؤ ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے نیولبرل مزدور دشمن ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانے سے خوفزدہ ہے۔ اسی وجہ سے اس پر سرمایہ داروں کی جانب سے بھی دباؤ بڑھ رہا ہے کہ وہ جلد از جلد ایسے قوانین بنائے جن سے ٹریڈ یونین کمزور یا بالکل ختم ہو جائیں اور ہندوستان کے محنت کشوں کا مزید استحصال کرنا آسان ہو جائے۔ مودی کے سامراجی آقاؤں نے بھی اس ہچکچاہٹ پر ڈانٹ پلائی ہے۔ مودی کے ایک حمایتی اکانومسٹ نے 29 اگست 2015ء کی اشاعت میں لکھا، ''وزیراعظم (مودی) بہت اچھا مقرر ہے۔ لیکن وہ مشکل کام کرنے کی بجائے انہیں ملتوی کر رہا ہے۔۔۔ مودی کو سیاسی ناٹک کی زیادہ فکر ہے جبکہ قوانین پاس کروانے اور اصلاحات نافذ کرنے کے کٹھن کام کی اسے کوئی چنتا نہیں۔ ایک سابق وزیر نے شکایت کی ہے کہ مودی پر جوش تقریریں تو بہت کرتا ہے لیکن ان منصوبوں پر عملی جامہ پہنانا بھول جاتا ہے۔۔۔ سرمایہ کار شدید غصے میں ہیں کہ ٹیکس قوانین کی آسانی، کارپوریٹ ٹیکسوں میں کمی اور سرکاری اداروں کی نجکاری جیسے وعدوں پر تیزی سے عملدرآمد نہیں ہو رہا۔''

یقیناً ستمبر 2016ء کی عام ہڑتال کے بعد دی اکانومسٹ اور دیگر سرمایہ دار سمجھ چکے ہوں گے کہ مودی کس سے خوفزدہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود مودی نے سرمایہ داروں کو نوازنے کے لیے ہندوستان کی تاریخ کے سب سے بڑے اقدامات کیے ہیں۔ اپنے پہلے ہی سالانہ بجٹ میں مودی اور اس کے وزیر خزانہ ارن جیٹلے نے کارپوریٹ ٹیکس میں 25 فیصد کمی کا اعلان کیا تھا۔ محنت کشوں پر ان شدید حملوں سے توجہ ہٹانے کے لیے مودی نے پاکستان مخالف پراپیگنڈے کا بھی آغاز کیا اور مذہبی تعصبات کو ابھارا۔ مودی کے اس عمل سے سرحد کے اس پار پاکستان کے ملاؤں اور فوجی اشرافیہ کو مزید تقویت ملی اور انہیں اپنی گرتی ہوئی مقبولیت میں جان ڈالنے کے لیے نئے مواقع میسر

آئے۔آر ایس ایس ، شیو سینا اور وشوا ہندو پریشد جیسی ہندو بنیاد پرست تنظیموں کی متعصب تقریریں پاکستان میں ملاؤں کو یہاں پر نفرت پھیلانے کا موقع دیتی ہیں اور دونوں اطراف کے بنیاد پرست ایک دوسرے کی پھیلائی نفرت پر ہی پلتے ہیں۔اسی دوران سرحد اور لائن آف کنٹرول پر ہونے والی لڑائیاں اور ہلاکتیں دونوں اطراف کے رجعت پسندوں کو مزید مضبوط کرتی ہیں۔

ہندوستان کے حکمران طبقات کوشش کریں گے کہ محنت کش طبقے کی انقلابی صلاحیت کو زائل کیا جائے اور ان کو مایوس کیا جائے۔اس وقت اشد ضرورت ہے کہ اس انقلابی صلاحیت کو سیاسی رنگ دیا جائے۔کمیونسٹ پارٹیوں کی صفوں میں ہیجان موجود ہے لیکن ابھی اس کی شدت واضح نہیں ہے۔ان کی انتخابات میں شکست کے بعد بائیں بازو میں کوئی نیا متبادل بھی ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ان پارٹیوں کی قیادتوں میں موجود تضادات اب زبان زد عام ہیں۔بدقسمتی سے یہ اختلافات کسی نظریاتی نکتے پر نہیں بلکہ تنظیمی اور ذاتی نوعیت کے ہیں۔یہ قیادتیں سوویت یونین اور دیوار برلن کے انہدام اور چین کی سرمایہ داری کی واپسی کے عہد میں پروان چڑھے ہیں اور سخت مایوس اور بد گمان ہیں۔لیکن انہی 25 سالوں میں ایک نئی نسل جوان ہو چکی ہے جس پر ماضی کی ناکامیوں کا کوئی بوجھ نہیں۔پرانے لیڈر سوویت یونین کے انہدام کو سوشلزم کی ناکامی سمجھ کر مایوس ہیں جبکہ درحقیقت وہ سٹالنزم کی ناکامی تھی۔اسی مایوسی میں وہ سرمایہ داری کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور اس نظام سے مفاہمت کر لی۔بہت سے بائیں بازو کے لیڈر تو سٹالنزم کے دو مرحلوں کے انقلاب سے پسپا ہو کر اب ایک ہی مرحلے پر اکتفا کر چکے ہیں جو سرمایہ دارانہ جمہوریت کا مرحلہ ہے۔

لیکن سرمایہ داری کا بحران سماج میں بے چینی کو جنم دے رہا ہے اور اس نظام سے نفرت بڑھ رہی ہے۔چونکہ تمام پارٹیاں سرمایہ دارانہ نظام پر ایمان لا چکی ہیں اس لیے نوجوانوں اور محنت کشوں میں سیاست سے ہی نفرت اور بیزاری جنم لے رہی ہے۔لیکن موجودہ عہد تیز ترین تبدیلیوں کا عہد ہے اور اس میں خلا کو پر کرنے کے لیے حادثاتی شخصیات اور پارٹیاں جنم لیتی رہیں گی اور سیاسی بیداری کا عمل جاری رہے گا۔عام آدمی پارٹی کا ابھار اور زوال اس کی ایک مثال ہے۔لیکن یہ عارضی اور سطحی عمل تھا۔جیسے جیسے طبقاتی کشمکش میں شدت آئے گی ایسے عوامل دم توڑتے جائیں گے اور واقعات نوجوانوں اور محنت کش طبقے کے شعور پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہوئے انقلابی

مارکسزم کی قوتوں کو پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کریں گے۔لیکن یہ عمل طویل ہوگا کیونکہ مارکسزم کی یہ قوتیں مکمل انقلابی تبدیلی کے لیے درکار موضوعی عنصر کے طور پر کمزور ہیں۔اس دوران یہ فیصلہ بھی ہوجائے گا کہ یہ کمیونسٹ پارٹیاں اس نئی انقلابی لہر کی قیادت کرنے کے قابل ہیں یا بالکل بوسیدہ ہوکر ناکارہ ہوچکی ہیں۔

سرمایہ داری ہندوستان کو ترقی دینے میں تاریخی طور پر ناکام ہوچکی ہے۔بلکہ اس نے غربت، ذلت، محرومی، بیماری اور جہالت میں مزید اضافہ کیا ہے۔اس نظام کی حدود میں رہتے ہوئے محنت کشوں کے لیے ایک چھوٹی سی بہتری بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔لیکن ہندوستان اب تیز ترین تبدیلی کے جس دور میں داخل ہوچکا ہے اس میں طبقاتی کشمکش میں شدت آئے گی۔جلد سماج کی انقلابی تبدیلی کا سوال عوام کے سامنے آئے گا۔اس ہڑتال نے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان جیسے کثیر پہلو سماج میں بھی محنت کش ایک طبقے کے طور پر اکٹھے ہوکر فیصلہ کن لڑائی لڑ سکتے ہیں۔ہندوستان کا سوشلسٹ انقلاب صرف ہندوستان کے محنت کشوں کو اس نظام کی جکڑ بندیوں سے آزاد نہیں کرے گا بلکہ پورے خطے میں پھیلتے ہوئے انقلابی فتوحات حاصل کرے گا جہاں دنیا کی کل 22 فیصد آبادی ہے جبکہ 42 فیصد غربت پلتی ہے۔ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال کے انقلابات ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک ملک میں ابھرنے والی لہر پورے خطے میں پھیلے گی اور جنوبی ایشیا میں ایک رضاکارانہ سوشلسٹ فیڈریشن یا سوویت یونین قائم کرے گی۔صرف اسی طرح دنیا کی ایک چوتھائی آبادی کی نجات ممکن ہے۔اس انقلاب کے پوری دنیا پر پڑنے والے اثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

افغانستان

ویسے تو افغانستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک جمہوری حکومت ہے جو انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آئی ہے اور اسکی خارجی اور داخلی پالیسیاں وہ خود استوار کرتی ہے، لیکن اگر افغانستان میں آج کے زمینی حقائق کا جائزہ لیا جائے تو یہ باتیں بہت مضحکہ خیز ہیں۔ اشرف غنی اور عبداللہ بین لاقوامی کانفرنسوں اور غیر ملکی سربراہوں کے افغانستان دوروں کے دوران ہی نظر آتے ہیں۔ عام حالات میں وہ بنکر نما محلات میں دُبکے سے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بیرونی ممالک کے حکمران اپنی سکیورٹی ساتھ لاتے ہیں جس میں افغان حکومت کے یہ سربراہ خود کو زیادہ محفوظ تصور کرتے ہیں۔

اس وقت افغانستان میں 9,800 امریکی فوجی موجود ہیں اور رواں برس کے آخر تک یہ تعداد 5,500 تک لانے کا منصوبہ ہے۔ حال ہی میں امریکی جرنیلوں اور فوجی ماہرین نے صدر اوباما پر زور دیا ہے کہ افغانستان سے سامراجی انخلا کا پروگرام روک دیا جائے اور بیشتر ماہرین کی یہ رائے ہے کہ اگر ہیلری کلنٹن صدر بن گئی تو افغانستان میں مزید فوجی بھیج کر اس جارحیت کو مزید تیز کرے گی۔ لیکن افغانستان کی حکومت کو اپنا وجود بھی سامراجی فوجوں کے انخلا سے قائم رہتا ہوا نظر نہیں آتا۔ سامراجی قوتوں کے انخلا سے جنم لینے والے طاقت کے خلا کا فائدے اٹھاتے ہوئے طالبان نے نہ صرف جنوب اور مشرق میں اپنے روایتی مضبوط خطوں بلکہ شمال میں بھی پیش رفت کی ہے۔ ملا عمر کی تین سال قبل موت کی خبر کے بعد طالبان کے نئے لیڈروں کو اپنا لوہا منوانے کے لیے عسکری کامیابیوں کی ضرورت تھی۔ اس حملے کا مقصد جنگجوؤں کے جذبے کو بلند رکھنا اور انکے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنا ہے۔ اس وقت 2001ء کے بعد سب سے زیادہ علاقہ طالبان گروہ کنٹرول کر رہے ہیں یا پھر اس کے لیے لڑ رہے ہیں۔ گزشتہ برس سامراج کی حمایت یافتہ ریاستی سکیورٹی فورسز کو بدترین نقصان اٹھانے پڑے۔ اوسطاً ہر ماہ ایک ہزار سے زائد فوجی یا پولیس اہلکار ہلاک یا زخمی ہوئے ہیں۔

سامراجی سنگینوں کے تخت پر بیٹھ کر کٹھ پتلی حکومت سے حاکمیت تو مل جاتی ہے، چین نہیں

نصیب ہوتا۔ اس حکومت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ افغانستان میں صرف ایک سامراج کی مداخلت نہیں ہے بلکہ مختلف عالمی اور علاقائی سامراجی طاقتوں کی بھی گہری مداخلت ہے، جن کے مفادات مشترک بھی ہیں اور متضاد بھی! کچھ عرصے قبل جب 'ماہرین ارضیات' کی تحقیق سامنے آئی ہے کہ افغانستان میں تین ہزار ارب ڈالر سے زائد کے صرف معدنی وسائل پائے جاتے ہیں تو سامراجی اجارہ داریاں اس بدنصیب خطے پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ ان کارپوریٹ سرمایہ داروں نے اپنے تابع سیاست دانوں اور ریاستی آقاؤں کو اس خانہ جنگی میں دھکیلنا شروع کر رکھا ہے۔ ان سامراجی قوتوں کی مقامی پروردہ پراکسیاں، حکومتوں اور ریاستوں میں بھی پائی جاتی ہیں اور طالبان اور دوسرے متحارب جنگجو گروہوں میں بھی ملتی ہیں۔ ان پر سرکاری اور خفیہ سرمایہ کاری سے یہ متحارب سامراجی ریاستیں اور ان کے حکمران طبقات اپنے مالیاتی مفادات کو بڑھوتری دینے کے لیے ایک تیز تنگ ودو میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں نہ صرف مغربی سامراجیوں کی جارحیت جاری ہے بلکہ چینی، ہندوستانی، ایرانی اور سعودی پراکسیاں بھی اس آگ اور خون کے کھیل کو مزید بھڑکا رہی ہیں۔ جب ان مختلف سامراجی قوتوں کے درمیان مفادات کی کہیں مفاہمت ہو جاتی ہے تو یہ اور ان کی پراکسیاں حلیف بن جاتی ہیں، لیکن جب سودے نہ بن سکیں تو پھر جنگی تصادم شروع کروا دیا جاتا ہے، جس سے تاراج افغانستان اور اس خطے کے محنت کش اور غریب ہی ہو رہے ہیں۔ چینی حکمرانوں نے تقریباً دو دہائیوں سے افغانستان کی معدنیات پر نظر جمائی ہوئی تھی۔ اس وقت افغانستان میں سب سے بڑی سرمایہ کاری چینی سرمایہ داروں کی ہے۔ افغانستان کے صوبے لوگر میں تانبے کی 'اینا ک' کان، جس کا شمار دنیا کی بڑی کانوں میں ہوتا ہے، اس وقت چینی کمپنیوں کے پاس ہے۔ اسی طرح 'دریائے آمو' کے نواح میں تیل اور گیس کے بے پناہ ذخائر چینی حکمرانوں کی ہی ملکیت میں ہیں۔ اس لیے وہ بھی افغانستان میں جاری پراکسی لڑائیوں میں اپنی حصہ داری ڈال کر اپنے ذخائر کی حفاظت سستے داموں ''آؤٹ سورس'' کرتے رہتے ہیں۔ طالبان کے کئی فیصلہ کن دھڑوں کے چینی حکمرانوں سے گہرے روابط ہیں اور چین کے باقاعدہ دوروں کی خبریں بھی آتی رہتی ہیں۔ اسی طرح یورپی سامراجی بھی تھوڑی بہت واردات کرتے رہتے ہیں۔ روس کے موجودہ مافیا حکمران بھی باز آنے والے نہیں ہیں۔ ایرانی ملاؤں اور عرب

شہنشاہوں کی پرانی جنگوں اور استعماری عزائم کے لیے اپنائی جانے والی پالیسیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ پاکستانی حکمرانوں کی 'تذویراتی گہرائی' (Strategic Depth) کی پالیسی تو کئی دہائیوں سے جاری ہے لیکن اب بھارتی حکمران اس خطے اور مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئی اور زیادہ کھلی اقتصادی مداخلت پر اتر آئے ہیں۔

مودی کی وزارت عظمیٰ میں جہاں ہندوستان کے عوام میں غربت بڑھ ہی رہی ہے، معاشی ناہمواری شدید تر ہے اور ساتھ ہی دنیا کی سب سے تیز معاشی شرح نمو کا چرچا بھی ہے، وہیں خارجہ محاذ پر بھی اس جارحانہ پالیسی کا اظہار ہو رہا ہے۔ افغانستان میں سلمیٰ ڈیم کی تعمیر کے آغاز کے بعد اس کا نام ''افغانستان بھارت دوستی'' ڈیم رکھ دیا گیا ہے۔ مودی نے دوسرے ''منصوبوں'' کے لیے ایک ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا اعلان بھی کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سرمایہ کاری ہر 'بیرونی سرمایہ کاری' کی طرح افغانستان کو لوٹنے کے لیے ہی کی جا رہی ہے۔

اتنی عالمی و علاقائی ریاستوں اور سامراجیوں کی مداخلت اور ٹکراؤ سے افغانستان میں امن کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ سامراجی قوتیں افغانستان میں امن، آشتی اور خوشحالی کے لیے نہیں بلکہ گِدھوں کی طرح افغانستان کو نوچنے کے لئے اقتصادی اور جنگی مداخلتیں کر رہی ہیں۔ اس ہولناک کھلواڑ میں نہ صرف فوجی حکمت عملی جاری ہے بلکہ رائے عامہ بنانے اور افغانستان کے باسیوں میں اپنے اپنے حریف سامراجیوں اور ریاستوں کے خلاف نفرتوں کو ابھارنے کا کاروبار بھی زوروں پر ہے۔ رائے عامہ بنانے والے بیشتر ادارے جن میں میڈیا، ملاں، ریاستی اہلکار، سماجی کارکنان وغیرہ شامل ہیں اس کام پر اپنے اپنے داخلی اور خارجی آقاؤں کے مفادات کے لئے بھاری اجرتوں پر معمور ہیں۔ یہیں پر پاکستانی ریاست کا کردار بھی سامنے آتا ہے۔

افغانستان میں 1978ء کے افغان انقلاب کو تباہ کرنے کے لیے امریکی سامراج نے جو خفیہ جارحیت شروع کروائی اس کو (ڈالر) جہاد کا نام دیا گیا، اس میں پاکستان کے ظالم، رجعتی اور سفاک فوجی آمر ضیاء الحق کے ذریعے پاکستان کے ریاستی اداروں کو پوری طرح ملوث کر دیا گیا۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد امریکی سامراجی تو جزوی طور پر واپس چلے گئے، لیکن جو آگ وہ لگا کر گئے تھے وہ بھڑکتی ہی رہی۔ اس ردانقلابی قتل و غارت کو جاری کرنے کے لیے انہوں نے جو

منشیات اور خصوصاً ہیروئین کا نیٹ ورک اور دوسرے مجرمانہ کاروبار شروع کروائے' وہ پھیلتے پھولتے رہے۔ افغانستان تو کیا پاکستان میں بھی ڈالر جہاد کے مضمرات سے منشیات، بنیاد پرستی اور کلاشنکوف کلچر ایک ناسور کی طرح پھیلنا شروع ہوگیا، جواب کالے دھن کے طور پر اس ملک کی معیشت کے جسم کے اندر ایک بھیانک ناسور بن کر پل رہا ہے۔ اس طرف سے جو پراکسیاں بنائی گئی تھیں' وہ اس کالے دھن کی کرامت سے گدھا گاڑیوں سے اٹھ کر جہازوں اور بھاری گاڑیوں کے مالک بن گئے۔ اسلحے اور منشیات کے کاروبار نے ان کو کالے دھنوان بنا دیا تو انہوں نے اپنے منشیات، اسلحے اور خاص طور پر مختلف ریاستوں کی مداخلت پر مبنی دہشت کی فروختگی کے کاروبار کو وسعت اور جدت بخشی۔ پہلے تو وہ اپنی وفاداریاں بیچا کرتے تھے مگر پھر انکو کرائے پر دینے لگے اور زیادہ دام دینے والے گاہکوں کے لیے دشمنیوں اور دوستیوں کو الٹ پلٹ کرتے رہے۔ اسی طرح جہاں مذہب اور مسلکوں کی فرقہ واریت کے خون چڑھا کر اس ڈاکہ زنی کی خانہ جنگی میں استعمال کیا گیا وہیں نسلی اور قومیتی تضادات کو ابھار کر انکے گرد فرقہ بازی اور تصادم کروائے گئے۔ انکے پیچھے مختلف سرمایہ دار' اپنی ریاستوں اور پراکسیوں کے ذریعے اپنے منافع خوری کے مفادات بڑھاتے چلے گئے۔

افغانستان میں پشتون، تاجک، ہزارہ، ازبک، ترکمان، بلوچ اور دوسری قومیں اور نسلیں رہتی ہیں۔ جہاں افغانستان میں مرکزی ریاست کا کنٹرول بکھر گیا ہے وہاں یہ ملک ابھی موجود بھی ہے۔ کچھ علاقوں میں پاکستان کے حامی پائے جاتے ہیں اور کچھ خطوں میں پاکستان سے نفرت کرنے والے حاکم ہیں۔ اس لیے افغانستان کا ہر حکمران اس توازن کو برقرار رکھتے رکھتے ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ حامد کرزئی تو کابل کے محل اور بیرون ملک دوروں میں اپنی حکمرانی سامراجی پشت پناہی میں گزار گیا۔ لیکن کرزئی نے کبھی کبھی امریکی سامراج کو بھی بیانات میں رگڑ دینے کی پالیسی اپنائی ہوئی تھی۔ اس کا مقصد تو اپنی ''خودمختاری'' کا ناٹک کرنا تھا، لیکن وہ بار بار امریکی سامراج کے جرنیلوں اور واشنگٹن کے حکمرانوں میں تضادات اور سامراج کے کھوکھلے پن کی بھی عکاسی کرتا تھا۔ اشرف غنی اور عبداللہ کی یہ نام نہاد مخلوط حکومت میں غنی نے پہلے ہندوستان سے رابطے بڑھائے، بعد میں پاکستان کے قریب آنے کی کوشش کی' جی ایچ کیو، راولپنڈی کے کئی

دورے بھی کیے، اب پھر مودی کے دورے کے بعد وہ پاکستان کے خلاف زہر اُگل رہا ہے۔ لیکن پاکستانی حکمرانوں نے بھی ''تذویراتی گہرائی'' کی پالیسی کو کبھی ترک نہیں کیا۔ اچھے اور برے طالبان کے بیانات کا مطلب حامی اور مخالف طالبان ہوتا ہے، ان کی دہشت گردی سے سروکار نہیں رکھا جاتا، ان کے اہداف معنی رکھتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایسے کئی اطراف کے محاذوں اور متحارب قوتوں کی خانہ جنگی میں امن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سامراجی جارحیت سے افغانستان اور پاکستان کے وسیع تر عوام کسی امن اور خوشحالی سے محروم رہے ہیں۔ ان کے چلے جانے سے صورتحال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہ خانہ جنگی سامراجی اور انفرادی لالچ اور لوٹ مار کی لڑائی ہے۔ یہ (بھیانک) مقاصد اس وقت تک جاری رہیں گے، جب تک افغانستان میں اس قسم کے اقدامات نہیں کیے جاتے، جیسے نور محمد ترکئی کی انقلابی حکومت نے روسی فوج کی مداخلت سے قبل افغانستان میں سرمائے، جاگیرداری اور جہالت کی قوتوں کو توڑنے کے لیے شروع کیے تھے۔

ملا اختر منصور کے ڈرون حملے میں مارے جانے کے بعد مولوی حبیب اللہ اخوندزادہ، خبروں کے مطابق طالبان کا نیا سربراہ نامزد یا منتخب کیا گیا ہے۔ مولوی اخوندزادہ بہت کٹر مذہبی گردانا جاتا ہے اور اس کو سراج حقانی کی بجائے اس لئے سربراہ بنانے کا اعلان کیا گیا ہے تاکہ ''طالبان'' کی ''تحریک'' کی کسی 'علاقائی ریاست' سے قربت نہ ظاہر ہو سکے۔ حقانی نیٹ ورک کے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور ''ایجنسیوں'' سے قریبی تعلقات اب کوئی راز کی بات نہیں ہے۔

مولوی اخوندزادہ کو زیادہ تر ''مذہبی سکالر'' کے طور پر مشہور کیا گیا تھا اور وہ طالبان کی عدالتوں میں ''ہیڈ قاضی'' بھی رہ چکا تھا اس لیے اسکے جنگجو مزاج ہونے کا کچھ ابہام تھا۔ شاید یہی ابہام دور کرنے کے لیے طالبان نے دہشت گردی کی کاروائیوں کو تیز کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں جاری یہ آگ اور خون کا کھلواڑ صرف داخلی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس میں زیادہ تر عمل دخل بیرونی رہا ہے۔ اس خطے میں سامراجی قوتیں اپنے تسلط اور استعمار کے تسلسل کے لیے اور اپنی اقتصادی اور سیاسی حکمت عملی کو جاری رکھنے کے لئے یہ کھلواڑ کرتی رہی ہیں جو آج تلک مختلف شکلوں میں جاری ہے۔ پھر یہی پر اکسی گروہ ''کہیں اور'' سے زیادہ مال ملنے اور نئے آقا میسر آنے پر اپنے ان سامراجی آقاؤں کے ہی باغی ہو جاتے ہیں۔ 1996ء میں طالبان کے

کابل پر قبضے تک امریکی سامراج نے سعودی عرب اور پاکستانی ریاست کے ذریعے ان کی حمایت کی۔اس وقت پاکستان کی وزیراعظم بےنظیر بھٹو تھیں۔یعنی ضیاء آمریت کے بعد ''جمہوری'' ادوار میں بھی یہ زہریلی پالیسی جاری وساری رہی۔

حال ہی میں کابل میں بڑے پیمانے کے عوامی مظاہرے دیکھنے میں آئے ہیں۔اس میں ہزارہ کمیونٹی کے بڑے مظاہرے شامل ہیں جن پر طالبان اور داعش کی جانب سے حملے کیے گئے ہیں۔گزشتہ برس مارچ اور نومبر میں خواتین کے احتجاجی مظاہرے ایک سلگتی ہوئی بغاوت کی نشانیاں ہیں۔افغانستان میں طالبان کی مکمل فتح تقریباً ناممکن ہے۔یہ محض فوجی طاقت کے توازن کا سوال نہیں ہے بلکہ افغانستان کے عوام بالخصوص بڑے شہروں کے لوگ اس دہشت گردی اور بنیاد پرستی سے متنفر ہیں اور ضرورت پڑنے پر ان بنیاد پرست جنونیوں کے خلاف عوامی مزاحمت بھی کریں گے۔لیکن سامراجی افواج، خطے کی سامراجی طاقتوں کی پراکسی جنگوں، منشیات اور دوسرے جرائم پیشہ گروہوں کی موجودگی اور سرمایہ داری کے رہتے ہوئے یہ خلفشار اور بدامنی کے سلسلے جاری رہیں گے۔شکست خوردہ سامراجی اپنی قوتوں کو افغانستان میں نہیں رکھ سکتے لیکن وہ اپنی ہی بنائی ہوئی اس دلدل سے مکمل طور پر نکل بھی نہیں سکتے۔پاکستان خصوصاً پختونخواہ اور افغانستان کے انقلابات تہذیبی، تاریخی، اقتصادی اور جغرافیائی لحاظ سے مشترک حیثیت رکھتے ہیں۔موریٹیر ڈیورنڈ کی 1983ء میں کھینچی ہوئی ڈیورنڈ لائن ان عوام پر ایک خونی وار تھا جس نے ان کو دولخت کر دیا۔لیکن 123 سال گزرنے کے باوجود یہ خونی لکیر ان عوام کو تقسیم نہیں کر سکی۔ایک انقلابی فتح سامراج کے ایسے تاریخی جرائم پر مبنی سرحدوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دے گی۔

ایران

16 جنوری کو رات گئے اقوامِ متحدہ، یورپی یونین اور امریکہ نے ایران پر جوہری پروگرام کی بنا پر عائد اقتصادی و تجارتی پابندیاں باضابطہ طور پر اٹھالی گئیں۔ یہ پابندیاں جولائی 2015ء کے ویانا معاہدے کے تحت اٹھائی گئیں۔ اس اقدام سے نہ صرف سٹاک مارکیٹوں بلکہ سفارتی سیاسی حلقوں میں بھی بہت ہل چل پیدا ہوئی۔ یہ پابندیاں 2006ء میں مسلط کی گئی تھیں لیکن ایران پر سامراج کا سیاسی، سفارتی اور اقتصادی جبر تیس سال سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ اس طویل عرصے میں سامراجیوں نے ایک حوالے سے ایران کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔

جب سے امریکہ کے دم چھلے رضا شاہ پہلوی کی حکومت گری ہے امریکہ نے نہ صرف ایران پر سفارتی اور معاشی پابندیاں لگوائیں بلکہ 1980ء میں عراق کے ایران پر حملے کی بھی حمایت کی۔ صدام حسین کو اس 8 سالہ جنگ میں سب سے بڑی شہہ امریکہ کی جانب سے ہی تھی۔ اس جنگ میں دس لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ یہ بات بھی کسی حد تک درست ہے کہ عراق اور افغانستان پر براہ راست سامراجی جارحیت کا ایک مقصد ایران کے گرد گھیرا ڈالنا بھی تھا۔ عراق اور افغانستان کی جنگوں میں بیس لاکھ انسانوں کا خون ہوا۔

ان پابندیوں، ملاں اشرافیہ کی لوٹ مار اور ایرانی سرمایہ داری کے شدید بحران سے ایران کے عوام کو شدید مشکلات اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بیروزگاری کا ایک سمندر ہے اور افراطِ زر بعض اوقات 100 فیصد سے بھی تجاوز کرتی رہی ہے۔ نچلے درمیانے اور محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے لاکھوں خاندان دیوالیہ ہو کر تقریباً بھکاری بننے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ایران پر اگر ایک طرف جوہری پروگرام کی وجہ سے پابندیاں لگائی گئیں تو دوسری طرف اسرائیل، جو اس خطے میں سب سے زیادہ ایٹمی اسلحہ رکھنے والی ریاست ہے، اس پر پابندیاں تو درکنار سامراجیوں نے وہاں کے ''غیر قانونی'' جوہری پروگرام کی جانچ پڑتال پر ایک انسپکٹر بھی نہیں جانے دیا۔

جولائی 2015ء میں جب یہ پابندیاں اٹھانے کا معاہدہ ہوا تو ایران میں ایک جشن تھا۔ تہران سے لے کر اصفہان تک اور مشہد سے لے کر زاہدن تک زیادہ تر درمیانے طبقے پر مبنی افراد

کے ان مظاہروں میں جو نعرے اور بینر تھے ان میں مصدق، ظریف زندہ باد درج تھا۔ مصدق ایران کا دوسری عالمی جنگ کے بعد پہلا منتخب صدر تھا جس نے امریکی اور برطانوی تیل کی کمپنیوں کو نیشنلائز کر لیا تھا جو ایرانی تیل کی دولت لوٹ رہی تھیں، اس جرم کی پاداش میں CIA اور برطانوی خفیہ ایجنسیوں نے اس بائیں بازو کے صدر کا تختہ الٹ کر اس کو معزول کر دیا اور قدیم شاہی خاندان کے محمد رضا شاہ پہلوی کو تخت پر بیٹھا دیا تھا۔ محمد جاوید ظریف ایران کا موجودہ وزیر خارجہ ہے جس نے پابندیاں اٹھانے کے تمام مذاکرات میں ہراول کردار ادا کیا ہے۔

ان پابندیوں کے خاتمے سے ایرانی معیشت کو ابتدائی طور پر کسی حد تک مالیاتی اور تجارتی فائدے حاصل ہو سکیں گے۔ لیکن سامراجیوں نے اپنے مفادات کے تحت ہی یہ پابندیاں ختم کی ہیں۔ اب ایران کو تقریباً 160 ارب ڈالر کے خسارے سے نجات مل جائے گی اور تیل کی فروخت سے اسکی آمدن میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ ایران پانچ سے دس لاکھ بیرل تیل برآمد کرے گا، اس کے بینک عالمی بینکاری نظام میں داخل ہو سکیں گے اور دنیا بھر میں کاروبار کر سکیں گے۔ اسی طرح ایران کو 100 ارب ڈالر سے زائد منجمد رقم حاصل ہو سکے گی جس سے اس کی تیل کی صنعت کو درکار مرمت کی جا سکے گی۔ فرانس کی تیل کی اجارہ داری ''ٹوٹال'' نے اس شعبے میں ''مدد'' اور سرمایہ کاری کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ایران میں سیاحوں کو جانے کی اجازت بھی مل جائے گی جس سے تقریباً دو کروڑ سیاح دنیا بھر سے ایران ہر سال سیاحت کے لیے جا سکیں گے۔ لیکن اسی عمل میں امریکی اور یورپی صنعتی و مالیاتی اجارہ داریاں، جنہوں نے اس معاہدے کو کروانے میں دباؤ ڈالا تھا، وہ ایران میں سرمایہ کاری کر کے وہاں کے وسائل اور انسانی محنت کے استحصال کے ذریعے اپنے گرتے ہوئے منافعوں میں اضافے کے عزائم بھی رکھتی ہیں۔

اس معاہدے سے جو امر سب سے زیادہ عیاں ہوتا ہے وہ امریکی سامراج کی فوجی، سفارتی اور معاشی تنزلی ہے۔ امریکہ کے عوام اب بیرونی جارحیتوں اور مہم جوئی سے بہت تنگ آ چکے ہیں کیونکہ ان کے بھاری اخراجات کا خمیازہ انہیں ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ دوسری جانب امریکی معیشت کی خستہ حالی اور قرضوں پر مبنی بجٹ اور مالیاتی حالات امریکی حکمرانوں کے لیے اس قسم کی بیرونی جنگوں اور حملوں کی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ اپنے پرانے اتحادیوں، اسرائیل اور عرب بادشاہتوں کے مفادات کو پس پشت ڈالتے ہوئے پرانے حریف ایران سے مصالحت اور اسکے علاقائی کردار اور طاقت کو تسلیم کرنا

امریکی سفارتکاری کی بڑی شکست ہے۔ مشرق وسطیٰ کی بدلتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر سعودی عرب، کویت، قطر اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک مسلسل اسرائیلی ریاست سے خفیہ مذاکرات کر رہے ہیں حالانکہ ان کے درمیان ''سفارتی تعلقات'' اور سفارت خانے ہی موجود نہیں ہیں۔ عراق میں امریکی سامراج کی اپنی ہی تخلیق کردہ داعش کے بے قابو ہو جانے کے بعد یہ تعلقات نئی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ امریکہ کی تخلیق کردہ عراق کی ''قومی فوج'' داعش کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئی ہے۔ ان حالات میں ایران کی تربیت یافتہ شیعہ ملیشیا اور پیرا ملٹری ''انقلابی گارڈز'' کو استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہاں مفادات یکجا ہیں۔ ایران امریکہ تعلقات میں بھی اچانک ''گرمجوشی'' آ گئی ہے لیکن یہ سب کچھ کوئی پہلی مرتبہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ داخلی مزاحمت کو کچلنے کے لئے ایسی بیرونی سفارتکاری کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ امریکہ اور ایران کے درمیان ظاہری اور ''جزوی'' دشمنی کے طویل عرصے میں بھی رابطے اور کچھ پالیسیوں پر مفاہمت رہی ہے۔ 1983ء کا کرنل اولیور نارتھ کا 'کونٹراز' سکینڈل، 2001ء میں ہرات پر امریکی قبضہ کروانے میں معاونت یا پھر عراق پر امریکی جارحیت کے بعد بصرہ میں مقتدا الصدر اور اس کی ملیشیا کو قابو کرنے کا مسئلہ اسی خفیہ سفارتکاری کی کڑیاں ہیں۔ 2008ء کے مالیاتی کریش کے بعد سے امریکہ کا معاشی بحران اور اقتصادی کمزوری اس کی سفارتی اور عسکری پسپائی میں نظر آتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پچھلے 12 سال کی اقتصادی پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے امریکی اور یورپی اجارہ داریاں اندر خانے ایران کے ساتھ تجارت کرتی رہی ہیں۔ اب عالمی معیشت کا بحران بڑھ رہا ہے، چینی معیشت بیٹھ رہی ہے اور سامراجی اجارہ داریوں کو زیادہ بڑے پیمانے پر ایرانی منڈی اور خام مال وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ایران کی منڈی کھلتی بھی ہے تو عالمی سرمایہ داری کو بہت قلیل عرصے کی تقویت ہی ملے گی۔

اس معاہدے اور پابندیوں پر خاتمے کے خلاف سب سے زیادہ ردعمل اس خطے میں انہی امریکی 'اتحادیوں' کی جانب سے آیا ہے۔ دوسری جانب امریکہ میں ریپبلکن پارٹی کے دائیں بازو کے لیڈر اور ایران میں ملاں اشرافیہ کے سخت گیر دھڑے بھی اس مصالحت کے خلاف ہیں۔ ایران کی حکومت کو جو وسائل اور دولت اس عمل سے حاصل ہوں گے اس کی بندر بانٹ پر ایران کی اشرفیہ کے ان دھڑوں میں تضادات مزید شدت اختیار کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے

موجودہ صدر روحانی کے ''معتدل'' دھڑے کو سخت گیر دھڑوں کو زیادہ وسائل دینے پڑیں گے۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ایران کے محنت کش عوام کو اس معاہدے سے کیا حاصل ہوگا؟ موجودہ ''اصلاح پسند'' صدر اس وقت منتخب ہوا تھا جب ایران ایک سماجی دھماکے کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے جمہوری حقوق اور بہتر معیارِ زندگی کے وعدے کیے تھے۔ اس کے بعد اس نے ایران کے محنت کشوں کی توجہ مذاکرات کی جانب مبذول کروا دی تھی جو ان پابندیوں کے خاتمے کے لیے جاری تھے۔ عوام کو اتنی بڑی اور اتنے طویل عرصے سے امیدیں لگوا کر ان کو پورا نہ کر سکنا حکمرانوں کی حاکمیت کے لیے بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اب یہی امیدیں کھل کر عملی مطالبات کی شکل اختیار کریں گی۔ پہلے شاید جمہوری حقوق اور ریاستی جبر کے خاتمے کے مطالبات پر خصوصاً نوجوان نسل کی جانب سے آواز اٹھے گی جو اس سے گھٹن کا شکار ہے۔ بدعنوانی اور منافقت ایران کی موجودہ حاکمیت میں رچی بسی ہوئی ہے اور عوام میں اس کے خلاف نفرت بھی پائی جاتی ہے۔ ان حکمرانوں کو علم ہے کہ کچھ فوری رعائتیں عوام کو دینی پڑیں گی ورنہ ان کا انجام بھی حسنی مبارک جیسا ہونے کا امکان بڑھ جائے گا۔

ایران کی ملاں اشرافیہ کا جبر اور عوام کی معاشی ذلت اس لئے بھی ماند پڑ جاتی ہے کہ اس کے آس پاس عراق اور شام جیسی ریاستیں ہی دھڑام ہو گئیں ہیں اور بربریت کا ننگا ناچ جاری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایران کی 70 فیصد سے زائد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ ایران کے وزیر محنت و سماجی بہبود علی راعمی نے تسلیم کیا ہے کہ ''ایک کروڑ 20 لاکھ افراد نیم قحط کا شکار ہیں۔'' وزیر صحت علی اکبر سیارائی کے مطابق ''ہمیں افسوس ہے کہ ایران کی 78 فیصد آبادی غذائی اجناس کے فقدان کا شکار ہو کر مختلف بیماریوں میں مبتلا ہے۔''

(ایران فوکس، 21 فروری 2015ء)

ایران میں سرمایہ داری اور کرپشن نے درحقیقت طبقاتی فرق کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ ایک طرف اتھاہ غربت ہے تو دوسری جانب جابر ریاست پر براجمان ملاں اشرافیہ ہے جو چینی افسر شاہی کی طرح امیر سے امیر تر ہی ہوتی گئی ہے اور اب زیادہ تر ارب پتی سرمایہ داروں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ماضی میں ریاستی جبر کے ساتھ ساتھ ایرانی ریاست مہنگے تیل کی آمدن کا کچھ حصہ عوام پر خرچ کر کے بغاوت کو زائل کرتی رہی ہے۔ پھر تقریباً ایک دہائی تک ایران عراق

جنگ کا جنگی جنون اور قومی شاونزم عوام کو دبائے رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔ سعودی عرب دشمنی کا کارڈ اب بھی کھیلا جاتا ہے لیکن یہاں بھی امریکہ دشمنی کی طرح کئی معاملات میں پوری مفاہمت موجود ہوتی ہے۔

اگر پابندیاں اٹھنے کے بعد تھوڑی سی اصلاحات کا چھوٹا سا دروازہ بھی کھلتا ہے تو وسیع انقلابی تحریک کے راستے ہموار ہو سکتے ہیں۔ پابندیوں نے طبقاتی تفریق کو مدہم کر کے بیرونی دشمن کے خلاف ایک قوم کی کیفیت کو قائم کر رکھا تھا لیکن اب طبقاتی کشمکش کھل کر سامنے آئے گی۔ اسی طرح ایران کی ملاں اشرافیہ نے سامراجی جارحیت کے خلاف مزاحمت کے ایشو پر عوام پر اپنا تسلط لمبے عرصے تک برقرار رکھا ہے لیکن اب تو اسی ''شیطان'' سے مصالحت ہو چکی ہے اس لیے یہ نفسیاتی اوزار بھی حکمرانوں کے لیے اب زیادہ کارگر نہیں رہے گا۔

امریکہ اور چین جیسی معیشتیں ڈوب رہی ہیں، یورپی یونین ٹوٹنے کے آثار واضح ہیں۔ ایسے میں ایران کی خستہ حال سرمایہ داری بھلا کیا ترقی کر سکتی ہے؟ یہاں کون سی مغربی سرمایہ کاری آئے گی؟ پورے خطے میں کہرام مچا ہے، مشرق وسطیٰ علاقائی اور عالمی سامراجی قوتوں کی بھڑکائی آگ میں جل رہا ہے، اس آگ سے ایران اور سعودی عرب کی ریاستیں بھی بچ نہیں پائیں گی۔ ایران کی ملاں اشرافیہ کے خلاف گزشتہ ایک دہائی میں کئی بڑی تحریکیں (بالخصوص 2009ء میں) اٹھی ہیں۔ ایران میں بھی انقلابی تحریک ایک بار پھر بلند پیمانے پر ابھرے گی۔ پابندیوں کے خاتمے سے عوام میں اقتصادی اور سماجی بہتری اور آزادی کی امیدیں جب ٹوٹیں گی تو وہ ایک نئی بغاوت کو جنم دے سکتی ہیں۔ ایران کا انقلاب ناگزیر طور پر پورے خطے کے انقلاب سے جڑا ہے جسے اسرائیل کی صیہونیت اور عرب بادشاہتوں کی وحشت سے نبرد آزما ہو کر سرمائے کے جبر و جارحیت کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ایران کی تاریخ میں انقلابات اور تحریکوں کی بہت سی شاندار روایات موجود رہی ہیں۔ 1979ء کا انقلاب درحقیقت ابتدا میں ایران کی ''تودہ'' (کمیونسٹ پارٹی) کے کارکنان کے کنٹرول میں تھا۔ سٹالنسٹ قیادت کی 'مرحلہ وار انقلاب' پر مبنی تباہ کن پالیسیوں نے اس کو مذہبی فرقہ واریت اور ملائیت کی جھولی میں ڈال دیا۔ لیکن اب کی بار تحریک، جلد یا بدیر، بلند پیمانے پر اٹھے گی اور سرمایہ دارانہ نظام کو پھر سے چیلنج کرے گی۔ یہ تاریخ ساز حالات ایک بار پھر انقلابی مارکسزم کے نظریات اور لائحہ عمل کے متقاضی ہوں گے۔

عرب انقلاب اور مشرق وسطیٰ

پانچ سال قبل تیونس میں ایک انقلابی تحریک بھڑک اٹھی تھی۔اس نظام کے تجزیہ نگاروں کے تناظر کے بالکل برعکس انقلاب کی چنگاری شعلوں میں بدل گئی جو چند ہفتوں میں مشرق وسطیٰ، عرب دنیا اور نواحی خطوں کے بیشتر ممالک میں پھیلتی چلی گئی۔ بظاہر چٹان نظر آنے والی دہائیوں پر مبنی متعلق العنان حکومتیں زمین بوس ہونے لگیں۔لیکن انقلابی قیادت، لائحہ عمل اور نظریات کے فقدان کی وجہ سے یہ انقلابی ریلا جلد ہی پسپا ہوگیا۔گزشتہ کچھ سالوں کے دوران اسی رد انقلابی پسپائی کے تحت پورے خطے میں رجعت، ریاستی جبر اور قتل وغارت گری کا راج ہے۔انسانیت ایک بار پھر سسک رہی ہے۔

جو بنیادی مطالبات اور ارمان لے کر لاکھوں کروڑوں محنت کش اور نوجوان عرب انقلاب میں ابھرے تھے، ان میں سے کوئی بھی پورا نہیں ہو پایا۔محرومی آج بھی موجود ہے، بلکہ پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔انہی حالات میں 14 جنوری 2016ء کو تیونس میں انقلاب کی پانچویں سالگرہ منائی گئی۔ بڑے مظاہرے میں ہزاروں افراد نے شرکت کی اور انقلاب کی مقاصد کی تکمیل کے لئے جدوجہد جاری رکھنے کا اعادہ کیا۔مظاہرے میں شریک ایک 40 سالہ محنت کش خاتون نے اے ایف پی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ''انقلاب نے ہماری کوئی مدد اور بہتری نہیں کی، قیمتوں میں شدید اضافہ ہی ہوا ہے، نوجوان ابھی تک بیروزگار اور دربدر ہیں۔'' مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں ILO کے سروے کے مطابق 2011ء کے بعد خطے میں بیروزگاری کم ہونے کی بجائے بڑھی ہی ہے۔اس خطے کی آبادی کا 60 فیصد 25 سال سے کم ہے۔یاد رہے کہ 2011ء میں تیونس میں انقلاب کا آغاز ایک بیروزگار نوجوان محمد بوعزیزی کی سرعام خودسوزی سے ہوا تھا اور وسیع بیروزگاری اس تحریک کی بنیادی وجوہات میں سے ایک تھی۔

2011ء میں بغاوتیں کئی ممالک میں کسی نہ کسی پیمانے پر ابھری تھیں۔ بڑی تحریکیں تیونس، مصر، شام، اردن، اسرائیل اور یمن میں اٹھیں۔اسرائیل میں ہونے والے مظاہرے قابل ذکر ہیں جن میں 70 لاکھ کی کل آبادی میں سے 7 لاکھ افراد نے شرکت کی اور معاشی ناہمواری اور جبر و

استحصال کے خلاف سراپہ احتجاج بنے۔اس سے بھی زیادہ قابل ذکر بات ان مظاہروں میں لگنے والے ''ایک مصری کی طرح آگے بڑھو'' اور ''مبارک، اسد، بی بی نیتن یاہو مردہ باد'' کے نعرے تھے۔

مصر میں انقلابی تحریک کے آغاز پر اس کی مخالفت کرنے والی اخوان المسلمین کسی بائیں بازو کی منظم قوت کی عدم موجودگی میں انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آنے میں کامیاب ہوئی۔محمد مورسی نے صدر بننے کے بعد آئی ایم ایف کی ہی معاشی پالیسیاں نافذ کیں جن کے ردعمل میں 2013ء میں ایک بار پھر تحریک بھڑک اٹھی۔ 2013ء میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں شامل افراد کی تعداد 2011ء سے بھی دوگنا تھی۔ایک بار پھر سیاسی خلا پیدا ہوا جس کا فائدہ مصری فوج کے جنرل عبدالفتح السیسی نے اٹھایا۔صدارتی انتخابات کے ذریعے السیسی کے برسر اقتدار آنے کے بعد مصر میں آج عملاً ایک نئی آمریت قائم ہو چکی ہے اور ریاستی جبر کا بازار گرم ہے۔

شام، یمن، عراق اور لیبیا میں تحریک کے آغاز پر ہی سامراجی قوتوں نے مذہبی بنیاد پرستوں کو مسلط کر دیا۔آج یہ ممالک فرقہ وارانہ قتل عام اور خانہ جنگی میں غرق ہیں۔عراق فرقہ وارانہ اور لسانی بنیادوں پر عملاً تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔اسی طرح لیبیا بھی کئی حصوں میں منقسم ہے، ریاست کا وجود برائے نام ہی ہے۔خانہ جنگی کے بعد سعودی عرب کی مسلسل بمباری یمن کو تاراج کر رہی ہے۔شام میں امریکہ اور اس کے خلیجی اتحادیوں کی جانب سے مذہبی جنونی پراکسی گروہوں کے ذریعے مداخلت کے فوراً بعد ہی عوام کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ ''باغی'' بشارالاسد سے کہیں زیادہ درندہ صفت ہیں۔آج ترکی، سعودی عرب، قطر، ایران، امریکہ اور روس سمیت کئی قوتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ایک دوسرے سے شام میں برسر پیکار ہیں اور ایک وقت میں بلند ثقافت اور معیار زندگی کا حامل یہ ملک کھنڈرات میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔

بحرین میں 2011ء میں اٹھنے والی شورش بدترین ریاستی جبر کے باوجود اتار چڑھاؤ کے ساتھ جاری ہے۔عرب انقلاب سے خوفزدہ ہو کر سعودی عرب اور اردن کے حکمرانوں نے عوام کے لئے سہولیات اور مالی امداد کے 'ہنگامی پیکج' جاری کئے تھے۔لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کا بڑھتا ہوا بحران ان ممالک کی ریاستوں کو سبسڈی اور ماضی کی تمام عوامی سہولیات ختم کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔۔اس تیز معاشی گراوٹ کے سماجی اور سیاسی اثرات کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں۔سخت ویزا

قوانین نافذ کئے جارہے ہیں اور غیر ملکی محنت کشوں کو مقامی عرب افراد سے تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس سے ترسیلات زر میں کمی آئے گی اور پاکستان جیسی شدید بحران زدہ معیشتوں کو مزید دھچکا لگے گا۔

فلسطین میں دوبار 'انتفادہ' کی شکل میں بڑی سرکشیاں ہوچکی ہیں۔ 2005ء میں لبنان میں بڑی تحریک ابھری تھی۔ اسی طرح 2009ء میں ایران میں ہونے والے نوجوانوں کے مظاہرے سماج میں ریاست کے خلاف پنپنے والی نفرت کا اظہار تھے۔ لیکن 2011ء کے انقلابات میں بین الاقوامیت کا عنصر واضح تھا۔ قومی، مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصّبات کو روند کر یہ لہر آگے بڑھی تھی جس کا بنیادی کردار طبقاتی کشمکش پر مبنی تھا۔ اس میں شریک لاکھوں نوجوانوں کا مقصد سیاسی ڈھانچے میں ''جمہوریت'' کے نام پر سطحی تبدیلی نہیں تھا بلکہ وہ معاشی، سماجی اور ریاستی ڈھانچوں کو یکسر بدل کر بیروزگاری، غربت اور مہنگائی میں غرق اپنی زندگیاں بدلنا چاہتے تھے۔ دنیا کے کئی ممالک اور خطوں میں پھیل جانے والے انقلابات اس سے قبل 1848ء اور 1960ء کی دہائی میں بھی نظر آتے ہیں۔ 1848ء کے انقلابات سے متعلق برطانوی تاریخ دان اے جے پی ٹیلر نے لکھا تھا کہ ''تاریخ ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچی لیکن مڑ نہ سکی۔''

برطانوی اخبار ''دی انڈیپنڈنٹ'' کے مطابق آئی ایم ایف نے یہ انتباہ کیا ہے کہ عراق، ایران، اومان، الجزائر، سعودی عرب، بحرین، لیبیا اور یمن ایسے ممالک ہیں جن کے بجٹ کے خسارے تیل کی قیمتوں میں گراوٹ کی وجہ سے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ اب ان کو اُدھار لینا پڑے گا، کیونکہ ان کی رقوم 5 سال کے اندر ختم ہوجائے گی۔ اس وقت عرب دنیا کی 35 کروڑ 70 لاکھ آبادی میں اکثریت غربت، بیروزگاری اور انتشار کا شکار ہے۔ اسلامی بنیادی پرستی اور داعش طرح کی دہشت گردی زوروں پر ہے۔ 19 فیصد عرب نوجوان اس شمولیت کو غلط نہیں سمجھتے اور اس مذہبی جنون اور دہشت گردی میں شمولیت کی سب سے بڑی وجہ نوجوانوں کی بیروزگاری اور سماجی و معاشی بیگانگی ہے۔ مالیاتی سرمائے کا دہشت گردی سے رشتہ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ شام میں عام نوجوانوں کو جس ملازمت میں سب سے زیادہ اجرت حاصل ہوتی ہے وہ مذہبی دہشت گرد تنظیموں میں شمولیت ہی ہے۔ 1980ء سے 2010ء کے دوران اس خطے کی آبادی دگنی ہوئی تھی لیکن

وسائل اور آمدن میں ایک چوتھائی اضافہ بھی نہیں ہوسکا تھا۔ سب سے بڑی اور امیر خلیجی ریاست سعودی عرب میں حالات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ جس حکومت کو ہر سال 2,26000 روزگار دینا تھے وہ 2015ء کے سال میں صرف 49000 نوکریاں فراہم کرسکی ہے۔ پوری عرب دنیا میں صرف 35 فیصد افراد ایسے ہیں جن کو کسی بہتر مستقبل کی امید ہے۔ اس سے عوام کی اس نظام سے مایوسی اور مستقبل کی تاریکی سے جنم لینے والی پریشانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 'عرب انقلاب' سے پیشتر پورے خطے میں 12 سے 15 فیصد بے روزگاری تھی۔ اس انقلاب کی پسپائی کے بعد اب یہ شرح 25 سے 30 فیصد ہوچکی ہے۔ عرب ممالک کے عوام خصوصاً نوجوانوں میں اضطراب اور ہلچل بڑھ رہی ہے انکی بڑی اکثریت اسلامی پارٹیوں اور مذہبی دہشت گرد تنظیموں سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس اذیت سے نجات کا کوئی راستہ واضح نہیں ہورہا۔ عرب حکمرانوں کا یہ معاشی اور سیاسی جبر' سامراجی تجزیہ نگار ''دی اکانومسٹ'' کے مطابق ایک بڑے دھماکے کے حالات پیدا کررہا ہے۔ لیکن اس مرتبہ لوگ جمہوری اور مصنوعی سیاسی ڈھانچوں میں تبدیلی تک نہیں رکیں گے۔ یہ اس معاشی اور معاشرتی انقلاب کو پورا کرنے کے لیے آگے بڑھ جائیں گے۔ 2011ء کے انقلاب کے اصل محرکات' بنیادی انسانی زندگی کے مسائل کے حل کی تلاش ہی تھی۔ اس تلاش کی جستجو اپنی منزل تک پہنچنے کیلئے سماج میں انقلابی طلاطم جاری رکھے گی۔

2011ء کی انقلابی تحریک نے ایک بار پھر ثابت کیا تھا کہ تاریخ ختم نہیں ہوئی، طبقاتی کشمکش ناقابل مصالحت ہے اور جب تک طبقاتی تضاد موجود ہے، انقلابات جنم لیتے رہیں گے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد جوان ہونے والی نئی نسل کے لئے یہ سب کچھ بہت حیران کن اور ولولہ انگیز تھا۔ لیکن اس کی پسپائی سے اسباق سیکھنے کی ضرورت بھی ہے۔ عرب انقلاب میں ہراول کردار ادا کرنے والے نوجوانوں کے جذبے سچے تھے لیکن وہ راستے اور منزل سے ناآشنا تھے۔ حالات اور واقعات بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ اور نواحی خطوں میں اس نظام کے تحت عدم استحکام اور خونریزی میں اضافہ ہی ہوگا۔ کٹر سرمایہ دارانہ جریدہ ''اکانومسٹ'' تازہ شمارے میں لکھتا ہے ''جہاں فرقہ وارانہ تقسیم شدت اختیار کرگئی ہے، وہاں طبقاتی نفرت اور بغاوت کے رجحانات گہرے ہورہے ہیں۔''

فرقہ واریت، بنیاد پرستی اور سامراجی جنگیں صرف موت اور بربریت ہی دے سکتی ہیں۔ جنگ، بربادی اور محرومی کے اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف محنت کشوں اور نوجوانوں کو ایک حتمی جنگ لڑنی پڑے گی، اور یہ جنگ صرف انقلابی مارکسزم کے نظریات سے لیس ہو کر طبقاتی بنیادوں پر لڑی اور جیتی جا سکتی ہے۔ مصر میں انقلاب 1952ء کے 59 سال بعد 2011ء میں ابھرا تھا۔ ایک نئے انقلاب کے لئے دوبارہ 59 سال درکار نہیں ہوں گے۔ ضرورت انتظار کی نہیں، انقلابی قیادت اور قوت تعمیر کرنے کی ہے۔

مصر

مشرقِ وسطیٰ کا تاریخی، ثقافتی اور سیاسی لحاظ سے سب سے اہم ملک مصر ہے۔ مصر میں انقلابی فتح سے کامیابی، پورے خطے کے مستقبل کو روشن کرے گی اور یہاں کی تنزلی سارے مشرقِ وسطیٰ کو مزید بربادیوں کی کھائی میں دھکیلنے کا باعث بن رہی ہے۔ 1990ء کی دہائی سے 2010ء کے عرصے میں مصر کے فوجی آمر حسنی مبارک نے آئی ایم ایف کے نسخوں کے تحت معاشی ترقی اور شرح نمو میں بڑا اضافہ کیا تھا جسکے پوری دنیا کے سرمایہ دارانہ معیشت دانوں اور مفکروں نے بہت گُن گائے تھے۔ لیکن دنیا کے ہر مقام کی طرح، مصر میں بھی اس 'سامراجی استعمال' کو مرتب کرنے والے ادارے کی ترقی کے اس نسخے سے آبادی کی بھاری اکثریت اقتصادی ترقی کے باوجود مزید غربت ذلت اور محرومی میں گرتے چلی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ غم وغصہ ایک آتش فشاں کی طرح پھٹا اور حسنی مبارک کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد جب اخوان المسلمین کا 'مورسی' صدر بنا تو معاشی پالیسی اس کی بھی اسی آئی ایم ایف کے نسخے کے مطابق ہی تھی۔ اس سے چند ماہ میں ہی انقلاب کا پہلے سے دگنی طاقت کا ایک اور ریلا زیادہ شدت سے ابھرا اور مورسی کو معزول ہونا پڑا۔ ایک قیادت سے محروم تحریک کو فوجی جرنیل عبدالفتح سیسی نے ہائی جیک کر کے اپنی نیم آمریت مسلط کر دی۔ لیکن پالیسی اس کی بھی سرمایہ دارانہ طرز کی تھی۔ چونکہ انقلابی عوام دو مرتبہ انقلاب کر کے جب مایوسی میں چلے گئے تھے۔ ایک اندوھناک سکوت پیدا ہو چکا تھا۔ 'سیسی' نے سیاسی اور معاشی جبر سے معاشرے کو دبانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اقتدار کو کسی حد تک جبر کے ذریعے مستحکم کرنے

کے بعد سیسی نے مصر کے ایک نخلستان شرم الشیخ کے مقام پر سینکڑوں بیرونی حکمرانوں اور انکے نمائندوں کو دعوت دے کر بلایا۔ یہاں آنے والے بیشتر عرب حکمران انقلابی ریلے اور خصوصاً مصر میں ممکنہ انقلاب کے خوف سے لرزاں تھے۔ اسی لیے انہوں نے چاہتے نہ چاہتے ہوئے سیسی کے دعوؤں کو مان لیا اور اربوں ڈالر مصر کو مستحکم کرنے کے لیے سیسی پر نچھاور کر دیئے۔ اس میٹنگ میں اہم ترین شخصیت آئی ایم ایف کی سربراہ کرسٹین لگارڈ ہی تھی۔ اس نے اس صورتحال کو ''موقع ملنے کے لمحات'' قرار دیا تھا۔ آج اس کے ڈھائی سال بعد استحکام کم اور مصر انتشار کا زیادہ شکار ہے۔ آئی ایم ایف اب مصر سے 12 ارب ڈالر کے نئے ''قرضے'' پر مذاکرات کر رہا ہے اور زیادہ کڑی شرائط عائد کر رہا ہے۔ جس سرمایہ کاری کی تسلسل سے آمد کی امید تھی وہ سوکھ چکی ہے۔ پہلے سے موجود سرمایہ کار بھی راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ عوام کی حالت اس نیم آمریت کے آنے سے بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ہے۔ 14 فیصد سرکاری افراطِ زر کے باوجود ایک نیا ''ویٹ'' (ویلیو ایڈڈ ٹیکس) لگایا جا رہا ہے۔ تیل کی قیمتوں پر سبسڈی ختم کی جا رہی ہے۔ سرکاری بیوروکریسی کی نچلی پرتوں سے برطرفیاں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ خلیجی ریاستیں جو 15 سے 20 ارب ڈالر کی امداد دے چکی ہیں اب ہاتھ کھینچ رہی ہے۔ مصر کی کرنسی کو مصنوعی طور پر ابھار کر رکھا گیا ہے، جبکہ بلیک مارکیٹ میں ڈالر دوتہائی زیادہ قیمت پر ہی خریدا جا سکتا ہے۔ کرنسی میں یہ بحران اتنا شدید ہو گیا ہے کہ مصر کی ملاں اشرافیہ کے ادارے 'جامعہ الازہر' نے ایک فتوے کے ذریعے بیرونی کرنسی رکھنا 'گناہ کبیرہ' ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ دوسری جانب مصر کی دوتہائی معیشت اب غیر رسمی یا کالے دھن پر مبنی ہے۔ 40 فیصد یونیورسٹی گریجویٹ اور نوجوان بیروزگار ہیں۔ مصر میں ڈاکٹروں کی بڑی کھیپ ہر سال فارغ التحصیل ہوتی ہے، لیکن ان کی اکثریت مصر کی بجائے سعودی عرب جا کر کام کرتی ہے۔ اگر ہم اس دور کا جائزہ لیں جب عرب میں سوشلزم ابھر رہا تھا، جمال عبدالناصر نے ہر گریجویٹ کو سرکاری ملازمت دینے کی گارنٹی دے رکھی تھی۔ تب ان میں سے کوئی بھی بیروزگار نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب مصر کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو دس دس سال کے انتظار کے بعد بھی ملازمت نہیں ملتی۔ 'سیسی' اندر سے ایک نئے انقلاب سے خوفزدہ ہے، اسی لیے وہ شاید حسنی مبارک کی طرح بے دریغ اور جارحانہ پالیسیوں کی بجائے کچھ میانہ روی سے چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن اس نظامِ زر کے بحران میں ہر پالیسی اس لیے ناکام ہوجاتی ہے کیونکہ اس میں معاشرے کو ترقی دینے کی صلاحیت ہی ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ مصر میں وسیع بیروزگاری اور معاشی حملوں کے پیشِ نظر طبقاتی تضادات پھر سے پک رہے ہیں جو ناگزیر طور پر جلد یا بدیر اپنا اظہار ایک نئے انقلابی دھماکے کی شکل میں کریں گے۔

سعودی عرب

تیل کی قیمتوں میں تیز ترین کمی کی وجہ سے سعودی عرب کو حکومت کی جانب سے لوگوں کو دی جانے والی مراعات میں سخت کٹوتیاں کرنا پڑ رہی ہیں۔ واضح رہے کہ اپریل 2011ء میں تیل کی قیمت 119 ڈالر فی بیرل سے کم ہوکر مختلف اتار چڑھاؤ سے ہوتی ہوئی اب 2016ء میں 40 ڈالر فی بیرل کے آس پاس منڈلا رہی ہے اور کئی معاشی ماہرین اس کے 35 ڈالر تک گرنے کے خدشے کا اظہار کر رہے ہیں۔ عالمی معیشت کی مزید سست روی یا نئے معاشی بحران کی صورت میں یہ مزید گراوٹ ناگزیر ہوگی۔ دنیا میں خام تیل پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک اب معیشت میں ''اصلاحات'' کے ذریعے تیل پر انحصار کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سعودی حکومت کی دولت کا 80 فیصد تیل سے آتا ہے۔ آئی ایم ایف کے ڈائریکٹر برائے ایشیا نے چھ ماہ قبل روزنامہ ٹیلی گراف سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''سعودی معیشت میں بڑے پیمانے کی بنیادی تبدیلی کرنا ہوگی... حکومت کو تیل کی سبسڈی کے شاہ خرچ نظام میں اصلاحات کرتے ہوئے کئی نئے ٹیکس نافذ کرنا ہوں گے، جن میں استعمال کی اشیا پر وی اے ٹی (VAT) جیسے ٹیکس بھی شامل ہیں۔ یہ ضروری ہے اور یہ دشوار بھی ہوگا... یہ کئی سالوں پر محیط ایڈجسٹمنٹ کے عمل کا حصہ ہوگا''۔ آئی ایم ایف کے مطابق سعودی عرب کا خسارہ 140 ارب ڈالر تک ہوسکتا ہے، جو کہ حکومت کے اپنے اندازے 98 ارب ڈالر یا جی ڈی پی کے 15 فیصد سے کہیں زیادہ ہے۔ تیل کی قیمتوں میں کمی کے باعث سعودی عرب بین الاقوامی بینکوں سے قرض لے رہا ہے اور 1990ء میں کویت پر عراق کے حملے کے بعد یہ پہلی مرتبہ ہے کہ سعودی عرب نے اس سلسلے میں بین الاقوامی مارکیٹ کا رخ کیا ہے۔

آکسفورڈ اکنامکس کی تحقیق کے مطابق 1986ء میں تیل کی قیمتوں کے آخری بڑے کریش کے دوران تیل پیدا کرنے والے بڑے 25 ترقی پذیر ممالک میں سے 17 اپنے قرضے ادا کرنے کے قابل نہیں رہے اور دیوالیہ ہو گئے تھے۔ اس وقت تیل پیدا کرنے والے ممالک کے قرضوں میں اوسطاً 40 فیصد اضافہ ہوا تھا۔ آکسفورڈ اکنامکس میں گلوبل اکنامکس ریسرچ کے سربراہ گیبریئل سٹرن کے مطابق ''1980ء کی دہائی کی مثالیں بہت پریشان کن ہیں؛ تیل پیدا کرنے والے ممالک کا دیوالیہ ہونا ایک معمول بن گیا تھا اور محض چند ملک ہی اس سے بچے تھے''۔

اب چڑھتے ہوئے ڈالر کے مقابلے میں ریال کی فکسڈ قدر کو برقرار رکھنے کے لیے سعودی اپنے مالیاتی ذخائر کو ریکارڈ تیزی سے پھونکتے جا رہے ہیں۔ سعودی ریاست پانی اور بجلی پر سبسڈی کا خاتمہ کرنے جا رہی ہے اور آئی ایم ایف کی سفارشات کے مطابق انہیں تین کروڑ کی آبادی کو ایندھن میں دی جانے والی بڑی سبسڈی میں بھی بنیادی تبدیلیاں (کمی) کرنا ہوگی۔ تیل کی قیمت میں موجودہ گراوٹ کی بڑی وجہ بھی پیداوار بڑھانے کی سعودی پالیسی ہی ہے جس کا مقصد زیادہ پیداواری لاگت والے طریقوں سے نکلنے والے تیل سے مقابلہ بازی میں سبقت حاصل کرنا ہے جس میں امریکہ میں شیل (Shale) کے طریقے سے نکالے جانے والا تیل بھی شامل ہے۔ مسٹر سٹرن کے مطابق ''اجناس کی قیمتوں میں گراوٹ حکومتوں کے لیے انتہائی تشویش ناک ہے۔ اگر یہ تفریط زر چلتا رہا تو اس مرتبہ بہت برے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں''۔

گزشتہ چالیس برسوں کے معاشی عروج کے دوران جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور دیگر ممالک سے لاکھوں محنت کش روزگار کے لیے سعودی عرب آئے اور تیل کی صنعت، تعمیرات اور خدمات کے شعبے میں نسبتاً کم اجرتوں کی نوکریوں کے ساتھ ساتھ درمیانی سطح کی مینجمنٹ اور پیشہ ور ملازمتیں بھی کرتے رہے۔ 2015ء میں ملک کی 3 کروڑ 80 لاکھ آبادی میں سے 1 کروڑ 10 لاکھ غیر ملکی تھے۔ ان کے بھیجے ہوئے پیسے انکے ممالک کے لیے بہت اہم تھے۔ سعودی مرکزی بینک کے شمار کے مطابق 2015ء کی تیسری سہ ماہی میں 9.1 ارب ڈالر ملک سے باہر بھیجے گئے۔ اب محنت کشوں کی یہ سعودی عرب آمد، واپسی میں بدل رہی ہے۔ سعودی معیشت کی شرح نمو سست ہوتی جا رہی ہے اور تیل کی کم قیمت کی وجہ سے ریاستی بجٹ سنجیدہ خسارے کا شکار ہے اور حکومت

اخراجات میں کٹوتی پر مجبور ہے۔ 2006ء سے 2015ء کے دوران جی ڈی پی کی شرح نمو اوسطاً 5 فیصد سالانہ رہی، جو اس سال 2 فیصد سے بھی کم رہ گئی ہے۔ معاشی گراوٹ کے ابتدائی مراحل میں برطرف کیے جانے والے تقریباً سب افراد ہی غیر ملکی تھے جس کی ایک وجہ لیبر قوانین ہیں جن کی رو سے سعودی شہری کو ملازمت سے برطرف کرنا مشکل اور مہنگا پڑتا ہے۔

اب حکومت کے پاس سعودی شہریوں کے لیے سرکاری نوکریاں تخلیق کرنے کے لیے ماضی کی طرح پیسے نہیں ہیں۔ سعودی شہریوں میں بے روزگاری کی شرح 11.5 فیصد ہے جس میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ یہ حکومت کے لیے تشویش ناک ہے اور وہ غیر ملکیوں کو حاصل نوکریوں پر سعودیوں کو رکھنے کے لیے لیبر مارکیٹ میں بڑی مداخلت کر رہی ہے۔ ایک بڑی سعودی کمپنی کے اعلیٰ افسر نے جنوری میں رائٹرز سے بات کرتے ہوئے کہ سال کے آخر تک ایک کروڑ غیر ملکی محنت کشوں کا ملک چھوڑ جانا اس کے لیے حیران کن نہیں ہوگا۔ ممتاز سعودی معیشت دان فضل ال بوعینین کے مطابق ''معاشی تبدیلیوں کا دباؤ لیبر مارکیٹ پر پڑ رہا ہے جس کے نتیجے میں غیر ملکی محنت کشوں کی ایک بڑی تعداد واپس لوٹنا شروع ہوگئی ہے۔ کارپوریٹ شرح منافع میں گراوٹ سے غیر ملکی محنت کش مینجمنٹ کے اقدامات کا نشانہ بن رہے ہیں جو مستقل مالیاتی ادائیگیوں میں کمی لانا چاہتی ہے''۔ ابھی تک زیادہ تر برطرفیاں تعمیرات کے شعبے میں ہوئی ہیں جہاں 45 فیصد غیر ملکی کام کرتے ہیں۔ سرکاری ٹھیکوں میں کمی اور حکومت کی جانب سے ادائیگیوں میں تاخیر کی بنا پر کنسٹرکشن کمپنیاں پچھلے سال سے ہی ہزاروں محنت کشوں کو برطرف کر رہی ہیں۔

لیکن اس انتہائی مطلق العنان حکومت میں جہاں غیر ملکی محنت کش سب سے زیادہ جبر کا شکار ہیں، لیکن اب یہاں بھی یہ غلاموں جیسے تارکین وطن محنت کشوں کی ہڑتالیں اور بغاوتیں ہو رہی ہیں۔ سعودی عرب کے سب سے بڑے آجروں میں سے ایک بن لادن گروپ کے محنت کشوں نے 30 اپریل کو صوبہ مکہ میں کمپنی کے دفتر کے باہر احتجاج کرتے ہوئے کمپنی کی بسوں کی نذر آتش کر دیا۔ انہیں کئی مہینوں کی تنخواہ دیئے بغیر برطرف کر کے ملک سے نکالا جا رہا ہے۔ سعودی روزنامہ عکاظ کے مطابق آگ پر قابو پا لیا گیا اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ اس کمپنی نے 50,000 غیر ملکی محنت کشوں کو برطرف کر دیا ہے۔ سعودی روزنامے ''الوطن'' کے مطابق بن

لادن گروپ نے ان برطرف شدہ محنت کشوں کے ملک سے نکلنے کے لیے مستقل ایگزٹ ویزا جاری کیا ہے لیکن ان میں سے بہت سے واپس نہیں جانا چاہتے کیونکہ ان کے مطابق انہیں پورے پیسے ادا نہیں کیے گئے۔ کئی محنت کشوں کو چار ماہ سے اجرت نہیں ملی اور اب وہ روزانہ کمپنی کے دفتر کے باہر احتجاج کر رہے ہیں۔

بن لادن گروپ کی جانب سے کی جانے والی یہ برطرفیاں کمپنی کی کل افرادی قوت 200,000 کا پچیس فیصد ہیں۔ یہ کمپنی القاعدہ کے سابق سرغنہ اسامہ بن لادن کے والد نے 1931ء میں قائم کی تھی۔ اس نے بڑے تعمیراتی منصوبے مکمل کیے ہیں جن میں دارلحکومت ریاض میں بلند عمارتیں اور مغربی بندرگاہ جدہ میں یونیورسٹی اور ائیر پورٹ شامل ہیں۔ بن لادن گروپ کے ایک عرصے سے محنت کشوں کے ساتھ اجرتوں پر تنازعات چلے آ رہے ہیں اور مارچ میں ریاض میں کمپنی کے دفتر کے سامنے احتجاج ہوا تھا۔ گزشتہ برس مکہ میں حج کے دوران گرنے والی کرین بھی اسی کمپنی کے پراجیکٹ کا حصہ تھی جس کی تباہی سے 107 افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ اس سانحے کی وجہ سے بھی کمپنی کو کافی دباؤ کا سامنا ہے۔

سعودی شاہی خاندان عیاشی، اوباشی اور بدمعاشی میں اپنی مثال آپ ہے۔ 1932ء میں باقاعدہ طور پر قائم ہونے والی یہ بادشاہت برطانوی سامراج کی خدمت گزاری کے عوض سعود خاندان کو عطا کی گئی تھی۔ اس کے کچھ سال بعد وہاں تیل دریافت ہوا جس کے بعد سعودی شاہی خاندان کی دولت اور طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ محنت کشوں کا بدترین استحصال اور دنیا بھر میں اسلامی بنیاد پرستی اور دہشت گردی کی مالی معاونت کرنے والے اس خاندان کے افراد اربوں ڈالر ہر سال اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ شاہی خاندان کی بیگمات کروڑوں ڈالر کے صرف زیورات اور میک اپ وغیرہ ہر سال خریدتی ہیں۔ دنیا بھر میں شاہی خاندان کے مختلف افراد کے سینکڑوں محلات اور عیاشی کے اڈے ہیں۔ ان کی دولت اور عیاشی کا عالم کیا ہے اس کا اندازہ شہزادہ ولید بن طلال کے لائف سٹائل سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ موصوف کے محل میں 317 کمرے اور پانچ باورچی خانے ہیں جن میں کام کرنے والے درجنوں باورچی دنیا بھر کے کھانے تیار کرنے میں ماہر ہیں اور صرف ایک گھنٹے کے نوٹس پر دو ہزار افراد کا کھانا تیار کیا جا سکتا ہے۔ ولید بن طلال

کے پاس 730 ملین ڈالر کے صرف زیورات ہیں، اس کے محل نما طیارے بوئنگ 747 کی مالیت 220 ملین ڈالر ہے جس میں دو بیڈ روم اور 14 نشستوں پر مبنی ایک ڈائننگ روم بھی موجود ہے۔ وہ اس وقت جدہ میں دنیا کی سب سے بلند ترین عمارت ''کنگڈم ٹاور'' تعمیر کر رہا ہے جو دبئی کے برج خلیفہ سے بھی بلند ہوگی۔ اور یہ سب اس خاندان کے صرف ایک فرد کی داستان ہے۔ سعود خاندان کے ممبران کی کل تعداد 15 ہزار کے لگ بھگ ہے تاہم زیادہ تر دولت اور طاقت دو ہزار افراد کے ہاتھوں میں مرکوز ہے، آپسی دھڑے بندیاں اور محلاتی سازشیں معمول ہیں اور بڑھتے ہوئے بحران کے ساتھ شدت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ موجودہ حالات میں یہ کیفیت سعودی ریاست میں کسی بھی غیر معمولی صورتحال کو جنم دے سکتی ہے۔

2011ء میں بحر اوقیانوس کے ساحل سے لے کر بحیرہ عرب کے کناروں تک، پورے خطے میں پھیلے عرب انقلاب سے حکومتیں لرز کر رہ گئیں تھیں اور کئی ایک کا تو خاتمہ ہو گیا۔ انتہائی جبر اور بربریت کے ساتھ ساتھ کچھ خلیجی ممالک نے بغاوت کو زائل کرنے کے لیے عوام کو کچھ مراعات دینا شروع کر دیں۔ سعودی بادشاہ کی جانب سے عوام کو دی جانے والی مراعات سے ان کی معیشت پر کافی بوجھ پڑا۔ اب تیل کی قیمت میں گراوٹ اور اس کے نتیجے میں معاشی بربادی کی وجہ سے یہ بادشاہت نہ صرف مراعات کے خاتمے بلکہ ظالمانہ کٹوتیاں کرنے پر مجبور ہے۔ یہ عمل نہ صرف غیر ملکی محنت کشوں کی روزی کے لیے تباہ کن ہے بلکہ پاکستان جیسے ممالک کی معیشت بھی بری طرح متاثر ہوگی۔ لیکن ان اقدامات سے سعودی شہریوں کے مسائل بھی حل نہیں ہو پائیں گے۔ نسل در نسل معاشی سہل پسندی کے عادی لوگ سعودی معیشت کے بحران کی سختیوں کو نہیں جھیل پائیں گے۔ مشہور فرانسیسی سیاست دان الیکسس ڈی تاکویل (1805-1859ء) نے کہا تھا کہ ''کسی بری حکومت کے لیے سب سے خطرناک لمحہ وہ ہے جب وہ اصلاحات کرنا شروع کرے''۔ اور یہ عمل سعودی عرب میں شروع ہو چکا ہے! ظاہری طور پر سعودی عرب میں بغاوت کو بہت سی دیوہیکل رجعتی قوتوں کا سامنا ہے لیکن اندر سے یہ ریاست کھوکھلی ہو چکی ہے۔ یہاں بھی اگر تحریک ابھرتی ہے تو اس کے خلاف بادشاہت کے 'جمہوریت' کے ذریعے خاتمے کی سامراجی سازش کی جائے گی اور کٹھ پتلی قیادت مسلط کرنے کی کوشش ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ 2011ء کے

انقلاب اور اسکے بعد رد انقلاب نے ثابت کیا ہے کہ اس خطے میں کسی صحت مند بورژوا جمہوریت کے پنپنے کا امکان ختم ہو چکا ہے۔ یہاں کی معاشی، ثقافتی، صنعتی اور دوسری سماجی کیفیات واضح کرتی ہیں کہ اتنی دولت کے باوجود یہاں سرمایہ داری نہ صرف انتہائی بوسیدہ شکل میں پائی جاتی ہے بلکہ ان حالات میں یہ نظام کوئی بورژوا جمہوریت دے ہی نہیں سکتا۔ سعودی عرب میں جب انقلاب ابھرا تو اسکی کامیابی صرف اس کے سوشلسٹ کردار سے ممکن ہے۔ بصورت دیگر شام اور لیبیا کی طرح کی خونریز صورتحال پیدا ہو سکتی ہے۔

شام

2011ء میں شام میں ابھرنے والی انقلابی تحریک بہت جلد ہی ایک خانہ جنگی میں بدل گئی اور آج شام کئی عالمی اور علاقائی قوتوں کی پراکسی جنگوں کا میدان بنا ہوا ہے۔ سامراج کی جارحیت، بنیاد پرستوں کی وحشت اور بیرونی طاقتوں کی مداخلت نے اس ملک کو تاراج کر کے رکھ دیا ہے۔ اکتوبر 2015ء میں لگائے گئے اندازوں کے مطابق پونے چار لاکھ افراد ہلاک اور تقریباً 80 لاکھ بے گھر ہو چکے ہیں جن میں بڑی تعداد بچوں، بزرگوں اور خواتین کی ہے۔

روس کی براہ راست مداخلت کے بعد بشارالاسد کی افواج اپنے اتحادیوں کے ہمراہ کئی اہم علاقوں میں خلیجی اور مغربی حمایت یافتہ بنیاد پرست پراکسی گروہوں کو کچلتے ہوئے پیش قدمی کر رہی ہیں۔ بڑی تعداد میں مہاجرین اور دہشت گردی کے مزید حملوں کے خوف کے زیر اثر امریکہ اور یورپی یونین اب تنازعے کا جلد حل چاہتے ہیں۔ تاہم روس اور بشارالاسد کو اب کوئی جلدی نہیں ہے کیونکہ ان کا پلہ وقتی طور پر بھاری ہے اور قطر اور سعودی عرب جیسے رجعتی حکمرانوں کے کٹھ پتلی متحارب جہادی گروہ تیزی سے پسپا ہو رہے ہیں۔ امریکہ کے لئے یہ ''اتحادی'' اب اس کے حریفوں سے زیادہ بڑا بوجھ بنتے جا رہے ہیں۔ امریکی سامراج اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے دوچار ہے اور مشرق وسطیٰ کی صورتحال پر اپنا کنٹرول کم و بیش کھو چکا ہے۔ بشارالاسد کی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی ہے اور عراق یا افغانستان جیسی انارکی سے بچنے کی واحد امید امریکہ کے لئے یہی ہے کہ بشارلاسد کا اقتدار اب قائم رہے۔ بصورت دیگر شام میں

امریکی سامراج اور اس کے ''اتحادیوں'' کے پیدا کردہ پراکسی گروہوں کو قابو کرنے والی کوئی قوت نہیں بچے گی۔

اسی تناظر میں ولادیمیر پیوٹن اور آیت اللہ خامنائی کی طرف مغربی میڈیا کا جارحانہ رویہ راتوں رات خاصا ''نرم'' ہو گیا ہے۔ کچھ مہینے پہلے تک بشارالاسد حکومت کے انہدام کے آثار نمایاں ہو رہے تھے لیکن روس کی براہ راست مداخلت نے صورتحال کو یکسر بدل دیا ہے۔ بشارلاسد کی افواج سست روی سے ہی سہی لیکن پیش رفت کر رہی ہیں۔ ترکی میں ناکام فوجی بغاوت کے بعد اردگان امریکہ سے دور اور روس سے قریب ہونے کی کوشش کر رہا ہے جو کہ بشارالاسد کا بڑا حمائتی ہے۔

بشارالاسد کی افواج نے داعش کے خلاف بھی کچھ پیش قدمی کی ہے، بالخصوص مشرقی حلب کے نواحی علاقوں میں۔ روس کی بمباری خاصی موثر رہی ہے جس کے ذریعے سرکاری افواج نے اپنی سپلائی لائن اور اسٹریٹجک مقامات پر کنٹرول کو مستحکم کیا ہے، سپاہیوں کا مورال بھی بلند ہوا ہے۔ اسی بنیاد پر کئی محاذوں پر پیش قدمی کی جا رہی ہے۔ ''باغی'' گروہوں کے حملوں کا جواب بھی ماضی کی نسبت باآسانی دیا جا رہا ہے۔ ایک سال پہلے تک صورتحال بالکل مختلف تھی۔

عرب انقلاب کے تسلسل میں شام میں 2011ء میں شروع ہونے والی انقلابی تحریک مختصر عرصے میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر زائل ہو گئی تھی۔ اس وقت سامراجی طاقتوں کے حمایت یافتہ داعش، النصرہ اور اسلامک فرنٹ جیسے مذہبی جنونی گروہوں کی بربریت کو دیکھ کر شامی عوام کے بڑے حصے کی حمایت ایک بار پھر بشارالاسد کی طرف مائل ہو گئی۔ عوام کی نظر میں تمام تر ریاستی جبر کے باوجود بشارالاسد کی حکومت ان درندہ صفت گروہوں کے وحشیانہ تسلط سے کہیں بہتر تھی۔ 2014ء کے انتخابات اگرچہ بالکل شفاف نہ تھے تاہم عوام کی بڑے پیمانے پر ان میں شمولیت اور بشارالاسد کی بھاری اکثریت سے کامیابی میں رائے عامہ کا اظہار موجود تھا۔ تاہم اس وقت بھی سرکاری افواج کی پوزیشن بہت کمزور تھی۔

خانہ جنگی کے آغاز سے قبل ہی شام کی ریاست میں موجود وسیع کرپشن اور اقربا پروری افواج کے بالائی حصوں کو زنگ آلود کر چکی تھی۔ زیادہ تر فوجی افسران قابلیت کی بجائے سفارش یا اثر و

رسوخ کی بنیاد پر تعینات ہوتے تھے۔ان کی نا اہلی خانہ جنگی میں نظر آئی جہاں کئی ممکنہ فتوحات، پسپائی میں بدل گئیں۔آسمان پر شامی فضائیہ کی مکمل اجارہ داری، دیوہیکل ٹینک فلیٹ اور تکنیکی طور پر کئی گنا بہتر فوج کے باوجود ہلکے ہتھیاروں سے لیس باغی گروہوں کو نہیں کچلا جاسکا۔کم تنخواہوں اور ہتک آمیز سلوک کی وجہ سے بھگوڑوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور سخت سزاؤں سے معاملات بگڑ ہی رہے تھے۔ایران اور حزب اللہ کے فوجی ماہرین کی شمولیت سے بھی یہ عسکری بحران حل نہیں ہو پا رہا تھا کیونکہ ان افراد کا تجربہ دفاعی جنگیں لڑنے تک محدود تھا اور شام کے حالات بالکل مختلف اور کہیں زیادہ پیچیدہ تھے۔تاہم روس کی براہ راست فضائی مداخلت اور روسی ماہرین کی تعیناتی سے شامی افواج کی پوزیشن قدرے مستحکم ہوئی۔انٹیلی جنس کے جدید ذرائع میسر آئے۔پاگل پن پر مبنی حملوں کی بجائے بڑے صبر سے اور سوچ سمجھ کر پیش قدمی کی جارہی ہے جس سے جانی نقصان میں خاطر خواہ کمی ہوئی ہے۔اسی طرح آبادیوں پر بیرل بم (بارود سے بھرے ڈبے جو ہوائی جہاز سے پھینکے جاتے ہیں) گرانے کی بجائے روسی فضائیہ حکومت مخالف گروہوں کے سپلائی روٹس اور ٹھکانوں کو بڑی مہارت سے نشانہ بنارہی ہے۔

شام میں امریکی پالیسی کی مکمل ناکامی بالکل عیاں ہے۔جن گروہوں کو امریکہ کی جانب سے داعش کے خلاف لڑنے کے لئے پیسہ، اسلحہ اور ٹریننگ دی گئی تھی ان میں کوئی بھی لڑنا چاہتا ہے نہ لڑسکتا ہے، ان جنگجوؤں کی اکثریت داعش کو ہی امریکی اسلحہ بیچ کر فرار ہوگئی یا ان کے ساتھ جا ملی۔فی الوقت برسر پیکار زیادہ شدت پسند گروہوں کا کلیدی مقصد بشارالاسد کی حکومت کا خاتمہ ہے۔امریکی سامراج کے سنجیدہ پالیسی ساز موجودہ حالات میں ایسا ہرگز نہیں چاہتے کیونکہ اسد حکومت کے خاتمے کا مطلب ریاست کا مکمل انہدام ہوگا جس کے نتیجے میں امریکیوں کے لئے ایک بار پھر افغانستان اور عراق والی صورتحال پیدا ہو جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ شام میں روس کی مداخلت کو بھی امریکی حکمرانوں نے غیر اعلانیہ طور پر خوش آئند سمجھا ہے کیونکہ اپنا اور اپنے اتحادیوں کا ڈالا ہوا گند صاف کرنے کے لئے امریکی سامراج کو روس کی ضرورت ہے۔تاہم امریکی سامراج کے ہی کچھ دھڑے (بالخصوص سی آئی اے کے کچھ حصے) اب بھی ان مذہبی جنونی گروہوں کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہیں۔یہ داخلی تضادات امریکی سامراج کے زوال کا ایک

اوراظہار ہیں۔

سرمایہ داری کا بحران نہ صرف معاشی، سماجی بلکہ سفارتی اور عسکری طور پر بھی اپنا اظہار کر رہا ہے۔ بشارالاسد کی افواج اگر پورے شام پر دوبارہ کنٹرول حاصل کر بھی لیتی ہیں تو جہادی گروہوں کی کاروائیاں اور خونریزی لمبے عرصے تک جاری رہے گی۔ علاقائی قوتیں اپنے سامراجی مقاصد کے لئے انہیں شام میں استعمال کرتی رہیں گی۔ جنوبی اور مرکزی شام میں ابھرنے والے نئے جنگی اور قبائلی سردار بھی ایسا ہی کردار ادا کریں گے۔ بشارالاسد کی حکومت کی داخلی ٹوٹ پھوٹ میں اضافہ ہوگا۔ ماضی میں لبنان کی طرح شام بھی کئی سال تک عدم استحکام کا شکار رہے گا۔

مشرق وسطیٰ اور نواحی خطوں میں انقلابی تحریکوں کی پسپائی نے اس خونریزی اور انتشار کی راہ ہموار کی ہے۔ عوام کے مسائل اور ذلتوں میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ایک پوری نسل در بدر ہے اور فوری طور پر بڑے پیمانے کی کسی تحریک کے امکانات نہیں ہیں۔ تاہم شام کی نجات ایک نئے انقلابی ریلے میں ہی مضمر ہے جو ناگزیر طور پر 2011ء کی طرح پورے خطے کو ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے گا۔ شام کی مصنوئی ریاست (جو عراق، لبنان، سعودی عرب، یمن اور خطے کے دوسرے ممالک کی طرح سامراجیوں نے اپنی بندر بانٹ میں سرحدوں کی لکیروں سے تقسیم کر کے بنایا تھا) اب وہ ٹوٹ رہی ہے۔ لیوانت کے خطے اور پورے مشرق وسطیٰ میں برپا ہونے والا انقلاب جسکا کسی ایک خطے یا ملک سے آغاز ہوسکتا ہے وہ نہ صرف معیشت، ریاست اور سماجوں کو تبدیل کرے گا بلکہ جغرافیہ ہی بدل دے گا۔ سامراجیوں کے پہلی عالمی جنگ کے بعد کی اس نوآبادکارانہ تقسیم کے جرم کو آنے والے وقت میں مکافاتِ عمل کا سامنا ہوگا۔

فلسطین

جہاں دنیا بھر میں اتنی تباہ کاریوں کا دور دورہ ہے وہاں فلسطینیوں کی حالتِ زار کوئی بہتر نہیں ہوئی بلکہ بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ہے۔ لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ دنیا فلسطینیوں کو فراموش کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ عالمی سرمایہ دارانہ ریاستوں اور طاقتوں کی سفارتکاری اور سودے بازی میں شاید اس مسئلہ کو فراموش کرنا ہی اس نظام کے ماہرین اور منصوبہ کاروں کا تقاضا ہے۔ کل جو مسئلہ فلسطین

کے سب سے بڑے چیمپئین بنے ہوئے تھے آج اسرائیلی صہیونیت کی جارحیت سے مصالحت کی پالیسی پر چل پڑے ہیں۔ کیونکہ ان کے اپنے ''قومی تقاضے'' جو دراصل انکے مال و دولت کے اکٹھے کرنے اور طاقت وحشت کو پروان چڑھانے کے اصل مقاصد ہوتے ہیں ان کے لیے فلسطینیوں کا سفارتی یا امت مسلمہ کے پراپیگنڈے کے اوزار کے طور پر استعمال کرنا فی الوقت اہمیت کھو چکا ہے۔ فلسطینی عوام جو پہلے ہی شدید کرب بھری زندگی گزار رہے ہیں اسرائیلی رجعتی ریاست کے براہِ راست یا بالواسطہ مقبوضہ ''وطن'' میں محکومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اب انحراف اور استرداد پر مزید بیگانگی کے احساس سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ایک طرف غزہ کی پٹی میں داخلی اور خارجی ظلم و جبر کا شکار ہیں تو دوسری جانب مغربی کنارے پر سامراج کی پٹھو محمود عباس حاکمیت کی بے نیازی اور لاتعلقی سے مجروح ہو رہے ہیں۔ اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کر رہے ہیں۔ اس سے فلسطینی عوام میں بے چینی اور اضطراب بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے کہ ان کی نام نہاد حلیف عرب ریاستیں ان سے ایک بھیانک غداری کی مرتکب ہو رہی ہیں۔

اقوام متحدہ سے لے کے مہذب مغرب کے حکمرانوں تک، سب کے سب اس صیہونی فسطائیت پر نہ صرف خاموش ہیں بلکہ پس پردہ اس کی حمایت بھی کر رہے ہیں۔ مذہبی جنون اور وحشت کو سلگا سلگا کر اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو جیسے دائیں بازو کے حکمران ''اسرائیل کی بقا'' کے نام پر سات دہائیوں سے ظلم اور بربریت کا کھلواڑ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ نہ صرف قدیم دیومالائی داستان کو جواز بنا کر فلسطینیوں سے ان کی زمین چھین لی گئی بلکہ اب تو انہیں دنیا کے سب سے بڑے اوپن ایئر قید خانے (غزہ) میں مقید کر دیا گیا ہے۔

امریکی سامراج دنیا کی سب سے بڑی عسکری اور اقتصادی طاقت ہونے کے باوجود صیہونی ریاست کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ اس ریاست کے ہر ظلم کو تسلیم کر کے اس کی حمایت کرنا مغربی سامراجیوں کی مجبوری اور کلیدی پالیسی بن چکی ہیں۔ فلسطین کے مسئلے پر تین عرب اسرائیلی جنگیں ہو چکی ہیں۔ ان جنگوں سے فلسطین کی غلامی میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا ہے۔ فلسطینیوں کی مظلومیت کو اپنے وحشی اقتدار کی طوالت کے لئے استعمال کرنے والے یہی عرب حکمران آج اسرائیلی حکمرانوں سے خفیہ اور سرعام خوب یارانے بڑھا رہے ہیں۔ اگر ان

عرب آمروں اور بادشاہوں کی دولت اور عیاشی کا موازنہ فلسطین کے تباہ حال عوام سے کیا جائے تو اس ''امت مسلمہ'' کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ خلیج سے لے کر مصر تک، یہ شاہی اور فوجی فرعون پورے خطے کو پاگل درندوں کی طرح چیر پھاڑ کر رہے ہیں۔ ''امت مسلمہ'' جس طرح آج آپس میں برسر پیکار ہے اس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ مسلمان قوم پرستی کتنی بڑی جعل سازی اور رجعت پر مبنی ہے۔

کچھ فلسطینی دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ عرب ریاستیں اس تنازعے کے لیے پہلے کی پالیسی (کہ اس کے لیے اسرائیلی ریاست مقبوضہ علاقوں سے دستبردار ہو کر واپس 67 کی سرحدوں پر چلی جائے) سے منحرف ہو رہی ہیں۔ پی ایل او کے ایک سینئر مفکر الیاس زنانری نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''اسرائیل عرب ریاستوں سے سیاسی تعلقات معمول کے مطابق بحال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن وہ یہ بحالی اسرائیلی فلسطینی تنازعے کو حل کیے بغیر ہی کرنا چاہتا ہے۔'' یہ احساس کہ عرب ریاستیں اس بنیاد پر تعلقات بحال کرنے میں سرگرم ہیں فلسطینیوں میں غداری کے زخموں کا درد مزید اذیت ناک کر رہا ہے۔ عرب حکمران اور ریاستوں کے اعلیٰ اہل کار اب شام عراق یمن وغیرہ کے مسائل پر زیادہ دھیان دینے لگے ہیں اور اپنی ریاستوں اور دولت کو ان بحرانوں کے خلفشار سے بچانے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ مصر کے فوجی آمر عبدالفتح السیسی کی حکومت نے مصر اور غزہ کی سرحد بند کر دی ہے۔ اس سے فلسطینیوں کی معاشی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اب یہ خبریں گردش کر رہی ہیں کہ جلد ہی اسرائیل کا وزیراعظم بینجمن نیتن یاہو مصر کا سرکاری دورہ کرنے والا ہے۔ نیتن یاہو نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ عرب حکمران اب اسرائیلی ریاست کو اپنے حلیف کے طور پر دیکھنے لگے ہیں۔ اوبامہ کی صدارت میں امریکی سامراج نے اپنی موضوعی کمزوری کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ سے فرار کی جو پالیسی شروع کی ہے اس میں ایران سے ہونے والا جوہری معاہدہ اسرائیلی اور عرب حکمرانوں کے لیے سنگین تشویش کا باعث بنا ہے۔ عراق، شام اور یمن میں یہ فریقین ایران اور اسکی حمایت یافتہ قوتوں کے مدمقابل آ گئے ہیں۔ اسرائیل کی سابقہ وزیر خارجہ زہی لیونی نے بیان میں خلیجی ریاستوں اور عرب حکمرانوں کے اس نقطہ نظر کے بارے میں کہا کہ ''اس خطے کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر اور ادراک ایک جیسا ہو گیا

ہے''۔اردن اور ترکی کے ساتھ اسرائیل کے سفارتی تعلقات بھی قائم ہیں اور کچھ عرصے سے انکی فوجی اور بیرونی حکمتِ عملی کی اینٹلی جنس بھی باہمی طور پر مرتب کی جارہی ہے۔جنرل سیسی حکومت نے نہ صرف غزہ کا باڈر بند کیا ہے کہ بلکہ وہاں سے اسلحہ سمگلنگ کے بہانے عام ضروریات ترسیل کرنے والی سرنگوں میں بھی سیوریج چھوڑ کر انکو بند کر رہی ہے۔دوسری جانب مصری آمریت نے اسرائیلی حکمرانوں سے فلسطین کے ''امن'' کے لیے اپنا ایک پلان شروع کیا ہے جس کو سعودی اور دوسرے عرب حکمرانوں کی حمایت حاصل ہے۔اس میں فسلطینیوں کے حقوق اس حد تک نظر انداز ہیں کہ ایک اسرائیلی سفارتکار بھی یہ کہہ اٹھا کہ ''سنجیدہ مذاکرات کے اجراع کے امکانات مخدوش ہوگئے ہیں''۔27 جون کو ترک اور اسرائیلی وزرائے اعظم نے باہمی تعلقات کو معمول پر لانے کی ڈیل کا اعلان کیا ہے۔اس ساری سفارتکاری سے بہت واضح ہوتا ہے کہ حکمران کہیں کے بھی ہوں انکی داخلی پالیسیاں کشمیریوں فلسطینیوں یا دوسری مظلوم قومیتوں یا عوام کے مفادات میں نہیں بلکہ حکمرانوں کے مفادات کے لیے استوار کی جاتی ہیں۔فلسطینی اس صورتحال کا بہتر ادراک رکھتے ہیں۔ایک حالیہ سروے کے مطابق 78 فیصد فلسطینیوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ فلسطین عرب حکمرانوں کا اب مسئلہ ہی نہیں رہا 59 فیصد نے عرب آقاؤں پر اسرائیل سے الحاق کا الزام لگا دیا۔عرب ممالک سے فلسطینیوں کی امداد میں سخت کٹوتیاں کر دی گئی ہیں اور مغربی ممالک نے بھی ان کی مالی مدد بند کرنی شروع کر دی ہے۔دوسری جانب سعودی درمیانے اور بالا دست طبقات کے صرف 18 فیصد اب اسرائیل کو اپنے ملک کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔لیکن عرب محنت کشوں اور عوام میں اسرائیلی ظلم و بربریت کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے۔مصر میں اس ممبر پارلیمنٹ کو جوتے مارے گئے جو اسرائیلی سفیر سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔پچھلے سال ایک ڈیڑھ درجن اسرائیلی مارے گئے جبکہ 200 سے زائد فلسطینیوں کو اس صیہونی ریاست کے کارندوں نے قتل کیا۔سامراج کا (دو ریاستی) حل ناکام ہو کر کوڑے دان میں گر چکا ہے۔فلسطینیوں اور عرب حکمرانوں کے یہ تضادات کوئی نئے نہیں ہیں۔اور نہ ہی اس مسئلہ کا انقلابی حل کوئی نیا پیغام ہے۔آج سے 50 سال قبل جنگ سویز کی کامیابی کے پہلے عشرے کے موقعہ پر 27 جولائی 1966ء کو مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ایک دیوہیکل عوامی جلسہ عام سے خطاب

کرتے ہوئے کہا تھا'' ہم عرب حکمرانوں پر فلسطین کی آزادی کے لیے قطعاً اعتماد واعتبار نہیں کر سکتے۔ پہلے سعودی عرب کو اپنی سرزمین سے برطانوی اور امریکی فوجی اڈوں کو ختم کرنا ہوگا۔ 1948ء میں جب ہم فلسطین کے لیے ہاتھوں میں اسلحہ لے کر جدوجہد کر رہے تھے تو عرب حکمرانوں نے غداری کی تھی۔ ہم اس لیے کو دھرانے نہیں دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پچھلے سال اعلان کیا تھا کہ آزادی فلسطین صرف ایک انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے''۔ آج بھی صورتحال ظاہری طور پر چاہے بدلی ہو لیکن حکمرانوں کے بنیادی کردار اور افکار نہیں بدلے۔ سفارتکاری اور مسلح جنگ دونوں فلسطین کو آزادی دلوانے میں ناکام رہے ہیں۔ جیسے صدر ناصر نے کہا تھا آج بھی فلسطین کی آزادی کے لیے ایک طبقاتی بنیادوں پر انقلابی تحریک درکار ہے۔ جس کو جغرافیائی اور تاریخی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے پورے خطے کے ممالک کے محنت کشوں اور نوجوانوں کی وسیع تر تحریک پر محیط ہونا پڑے گا۔ اسی طبقاتی جنگ میں اسرائیلی محنت کشوں کی شراکت اس صہیونی جارحانہ ریاست کو پاش پاش کرے گی جو اسرائیل میں بھی عوام کا طبقاتی استحصال جاری رکھے ہوئے ہے۔

عراق

صدام حسین کو ایک وقت میں بعث سوشلسٹ پارٹی نے اقتدار میں پہنچایا تھا۔ اسی پارٹی کی پالیسیوں کے تحت ہی عراق میں بڑے پیمانے پر معیشت کے نیشنلائز کئے جانے سے صحت، علاج، تعلیم، انفراسٹرکچر اور دوسرے شعبوں میں بیشتر عرب ممالک کی نسبت تیز ترقی ہوئی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تنگ نظر قوم پرستی اور افسر شاہی کی جکڑ میں ایسے 'سوشلسٹ' اقدامات لمبے عرصے تک پنپ نہیں سکتے۔ طبقاتی کشمکش کی بین الاقوامیت پر مبنی نظام، قومی ریاست کی قیود میں دم توڑ دیتا ہے۔ یہی سویت یونین اور چین میں ہوا تھا۔ صدام حسین نے اپنی آمریت کے جبر کو تو مسلط کرنا شروع کر دیا لیکن وسیع نیشنلائزیشن جیسے اقدامات بہرحال اسے برقرار رکھنا پڑے۔ سامراجیوں نے کردوں اور عراقی عوام پر مظالم کے دوران صدام کی پشت پناہی کی۔ ایران کے خلاف جنگ میں اسکی بھرپور فوجی مدد کی، لیکن جب صدام نے سامراجیوں کو ہی آنکھیں دکھانا

شروع کیں اور انکے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوا تو پھر جارج بش نے ''وسیع بربادی کے اسلحہ'' کے الزامات لگا کر عراق پر جارحیت کر دی (یہ الزامات بعد ازاں بالکل جھوٹے ثابت ہوئے)۔ ٹونی بلیئر اس کا سب سے بڑا حمایتی تھا۔ صدام کا تختہ الٹ دیا گیا۔ لیکن اس جنگ کے دوران لاکھوں بے گناہوں کو لقمہ اجل بھی بنا دیا گیا۔ لہو کے دریا بہائے گئے۔ اسلحے سے لے کر تیل تک کی ملٹی نیشنل کمپنیوں اور امریکی جرنیلوں نے سینکڑوں ارب ڈالر کمائے۔ ان سامراجیوں نے بعث پارٹی کی فوج اور ریاستی مشینری کو برطرف تو کر دیا لیکن وہ عراق میں کوئی متبادل ریاستی ڈھانچہ اور قومی فوج کھڑی کرنے میں ناکام رہے۔ اس سے عراق میں شدید خلفشار، بحران، فرقہ واریت اور مختلف جنگجو گروہوں کے درمیان علاقوں کی بندر بانٹ اور خونریزی نے جنم لیا۔ امریکہ کی کٹھ پتلی حکومت نے سنیوں کے خلاف متعصب رویہ اپنا کر فرقہ وارانہ تقسیم کو اور ہوا دی۔ ان حکمرانوں نے فرقہ وارانہ بنیادوں پر عوام کو تقسیم کر کے حکومت کرنے کی پالیسی اپنائی جو ان کے اپنے قابو سے باہر نکل گئی۔ پہلے مذہبی دہشت گرد القاعدہ کے روپ میں سامنے آئی اور آج یہ بربریت داعش کی صورت میں جاری ہے۔ عراق پر سامراجی جارحیت سے پہلے ایسے کسی دہشت گرد گروہ کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ داعش کے خلاف عراقی حکومت کی پشت پناہی سے شیعہ ملیشیائیں (مسلح گروہ) بھی اپنے تسلط اور دہشت کو فروغ دے رہی ہیں۔ آج عراق کی ریاست ٹوٹ پھوٹ گئی ہے اور پورا ملک عملی طور پر کئی حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ سامراجی افواج دم دبا کر بھاگ چکی ہیں۔ دہشت، بربریت اور خونریزی کا نہ رکنے والا سلسلہ جاری و ساری ہے اور جو آگ سامراجیوں سے بھڑکائی تھی اس میں کروڑوں بے گناہ لوگ جل رہے ہیں۔ پورا خطہ عدم استحکام، خانہ جنگیوں اور خلفشار کا شکار ہو چکا ہے۔

لیکن عراق پر جو زخم یہ خونخوار سامراجی لگا گئے ہیں اس سے لہو رس رہا ہے۔ تاہم اس خانہ جنگی اور خونریزی کی انتہاؤں میں بھی عراق میں طبقاتی بنیادوں پر فرقہ واریت سے پاک محنت کشوں کی بکھری ہوئی تحریکیں اور مظاہرے ہمیں بغداد، بصرہ اور دوسرے شہروں میں نظر آتے ہیں۔ مزید کسی فوجی جارحیت یا مذاکراتی معاہدوں سے فرقہ واریت کی خونریزی عراق میں ختم نہیں ہوگی۔ آج اگر کوئی ان سامراجیوں، ان کے دلالوں اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کا خاتمہ کر کے اس

نظام زر کی ہولناک اذیت سے عراق کے معاشرے کو نکال سکتا ہے تو وہ عراق کے محنت کشوں اور پسے ہوئے وسیع تر عوام کی یہی طبقاتی یکجہتی ہے جسے ایک تحریک میں ڈھل کر اس بربریت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ 'چلکوٹ انکوائری' جیسی رپورٹیں اور 'ڈی کلاسیفائیڈ' دستاویزات حکمران طبقات اپنی غلطیوں سے سیکھنے اور مستقبل میں لوٹ مار اور استحصال کی پالیسیاں زیادہ بہتر انداز میں مرتب کرنے کے لئے ہی شائع کرتے ہیں۔ انسانیت کے ان مجرموں کو نشان عبرت بنانے اور ان کے نظام کو مٹانے کا فریضہ محنت کش طبقے کو ہی ادا کرنا ہے۔

ترکی

ترکی میں فوج کے ایک دھڑے کی جانب سے ہونے والی ناکام فوجی بغاوت کو کارپوریٹ میں میڈیا میں اس طرح پیش کیا جا رہا ہے کہ اسے 'عوام' نے 'جمہوریت کے دفاع' میں سرکشی کر کے ناکام بنایا اور اردگان کی حکومت کو بچا لیا۔ فوجی بغاوت کے وقت سے بہت سی قیاس آرائیاں اور ابہام موجود ہیں اور مختلف مکتبہ ہائے فکر کے لوگ بہت سی سازشی تھیوریاں پیش کر رہے ہیں اور کچھ تو یہاں تک بھی گئے ہیں کہ یہ فوجی بغاوت اردگان نے فوج کے باغی عناصر سے جان چھڑانے کے لیے خود کروائی ہے۔ 17 جولائی کے گارڈین میں لکھا ہے، ''فوجی بغاوت کے منصوبہ ساز ابھی تک غیر واضح ہیں اور ہمیشہ کی طرح ترکی میں سازشی تھیوریاں بکثرت موجود ہیں۔ حکومت نے الزام امریکہ میں مقیم اسلامی سکالر فتح اللہ گولن پر لگایا ہے، جس پر اردگان نے دسمبر 2013ء میں ایک کرپشن سکینڈل کے ذریعے اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کا الزام لگایا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام اردگان نے خود کروایا تھا تا کہ فوج کو قطعی طور پر کچل کر اپنی کرسی کو مضبوط کرے۔ اس نظریے کی رو سے اپنے آپ کو ملک کی عوامی حکومت کا محافظ ثابت کر کے اردگان کے پاس اب مستقبل کی آمرانہ حکومت کے لیے ایک ٹھوس جواز ہاتھ آ گیا ہے کیونکہ فوجی بغاوت اس کے حمایتیوں کے اس کی آواز پر لبیک کہہ کر سڑکوں پر آنے کے بعد ناکام ہوئی''۔

یہ بات درست ہے کہ چند ہزار لوگوں کو مختلف شہروں میں ٹیلی وژن سکرینوں پر سڑکوں پر دکھایا گیا لیکن وہاں قطعاً لاکھوں لوگ نہیں تھے جیسا کہ 2011ء میں عرب انقلاب کے دوران

مصر، تیونس اور خطے کے دوسرے ملکوں میں ہوا تھا۔ یہ بات سچ ہے کہ اس ہجوم کی مداخلت اور رکاوٹ نے فوجی بغاوت کی کامیابی میں روڑے اٹکائے لیکن یہ ناکامی کی حتمی وجہ نہیں تھی۔ اس ہجوم کی اکثریت اردگان کے حمایتیوں کی تھی اور ترک سماج کی درمیانی اور پسماندہ پرتوں میں اس کی کسی حد تک حمایت موجود ہے۔ بنیاد پرست صدر کے وفادار مذہبی رہنماؤں نے بھی پہلی دفعہ مسجدوں کے نیٹ ورک اور لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے عوام کو 'جہاد' کے لیے سڑکوں پر آنے کی تلقین کی۔ لیکن حتمی طور پر فوج کی بالائی پرت کے حاوی دھڑے نے اس بغاوت کو ناکام بنایا جو اردگان کے حواری اور موجودہ حکومت کے شانہ بشانہ لوٹ مار اور بدعنوانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

لینن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ کچھ مخصوص واقعات، بالخصوص پسماندہ سماجوں میں، انقلابات اور عوامی تحریکوں کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس طرح کی عوامی تحریکوں میں ترقی پسند رجحانات رجعتی رجحانات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ فوج کے متحارب دھڑوں کے درمیان جھڑپوں کے علاوہ استنبول اور دوسرے شہروں میں بھی فوجی بغاوت کے حمایتیوں اور مخالفین کے درمیان جھڑپیں ہوئی ہیں لیکن ان واقعات کو بعض چینلوں میں معمولی کوریج دی گئی۔ اردگان کے حمایتیوں کی ریلیوں کے ساتھ ساتھ حکومت کے خلاف مظاہرے اور احتجاج بھی ہوئے جن پر آنسو گیس اور واٹر کینن کے ذریعے ریاستی حملے کیے گئے۔

لیکن بہت سے لوگ صرف اس فوجی بغاوت کی مخالفت میں باہر نکل آئے اور وہ قطعاً حکومت کی حمایت نہیں کر رہے تھے جو دن بہ دن سیاسی، معاشی اور ثقافتی طور پر جابر ہوتی جا رہی ہے۔ تاہم فوجی بغاوت کی ناکامی کی زیادہ معقول وجہ ناقص منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ مسلح افواج میں موجود داخلی تضادات ہیں جو کافی عرصہ سے چل رہے تھے۔ یہ سابقہ نوآبادیاتی ممالک میں 1950ء، 60ء اور 70ء کی دہائی میں ہونے والی فوجی بغاوتوں سے زیادہ مماثلت رکھتی تھی۔ تاہم ناقص منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ کُو کرنے والے فوج کی 'چین آف کمانڈ' کو بھی توڑنے میں ناکام رہے۔ فوجی بغاوت کی وجوہات اور باغیوں کے اغراض و مقاصد مبہم تھے۔ کئی سالوں سے ترکی میں اردگان کی کرپٹ اور جابر حکومت کے خلاف متواتر مظاہرے اور احتجاج ہو رہے تھے اور اردگان انتہائی جابرانہ طریقے سے اپنے فیصلے لاگو کر رہا تھا۔ بورژوا میڈیا اردگان کی اسلامی

بنیاد پرستی اور ترک فوج کی سیکولر بنیادوں کے درمیان تضادات کی بات کر رہا ہے۔ درحقیقت یہ اس تنازعے کا ایک معمولی حصہ ہے۔ ترک فوج کی نام نہاد سیکولر روایات اور اردگان کی اسلامی بنیاد پرستی، دونوں رجحانات اِس نظام کے معاشی اور سیاسی بحرانات میں الجھے ہوئے ہیں جو ایک صحت مند سرمایہ دارانہ سماج قائم کرنے میں ناکام ہوگیا ہے۔ حتیٰ کہ سماجی اور معاشی 'ترقی' درحقیقت سماجی تضادات کو مزید ہوا دے رہی ہے۔ ترقی کی اس غیر ہموار اور مشترک کیفیت نے سماج اور فوج میں نئے تضادات کو جنم دیا ہے۔

داعش اور دوسرے بنیاد پرست گروہوں کے بطور پراکسی استعمال میں ترک ریاست کے کردار، ترقی یافتہ یورپی معیشتوں کی نسبت اس کی پسماندگی اور ساتھ ہی سامراجی عزائم نے ریاست اور فوج کے مختلف دھڑوں کے اندر تضادات کو مزید شدید کر دیا ہے۔ نیویارک پوسٹ کے ایک مضمون میں اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے، ''وزیر اعظم سے صدر بننے والا رجب طیب اردگان اب ایک آمر بن گیا ہے۔ وہ حماس، القاعدہ سے منسلک نصرہ فرنٹ اور حتیٰ کہ داعش کی بھی حمایت کرتا ہے۔ کچھ حکومتوں کا خیال ہے کہ بنیاد پرست تنظیموں کی حمایت کم مدتی مقاصد پورے کر سکتی ہے لیکن طویل مدت میں اس کی بڑی قیمت چکانی ہوگی۔ پچھلے سال انقرہ اور استنبول میں ہونے والے دھماکوں نے اردگان کے ٹولے سے باہر کے لوگوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے''۔ فوجی حکمت عملی کے معاملات سے قطع نظر، اردگان کی جانب سے 'نان سٹیٹ ایکٹرز' کی حمایت، مالیاتی خرد برد، اقربا پروری، بدعنوانی اور لوٹ مار میں سے بعض ریاستی دھڑوں کو مطلوبہ حصہ نہ ملنا بھی بغاوت کی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

داعش کی حمایت، کردوں کے خلاف وحشیانہ فوجی جارحیت، گرتی ہوئی معاشی شرح نمو، مہنگائی، معاشی نابرابری اور اردگان کا سلطنت عثمانیہ کے سلطان بننے کا خواب کم از کم سماج کی ترقی یافتہ پرتوں کے لیے ناقابل قبول ہے۔ ٹریڈ یونینز پر جبر، احتجاجی مظاہروں کو وحشیانہ طریقے سے کچلنا اور ریاستی دہشت گردی کا بے دریغ استعمال اس بے چینی کی وجوہات ہیں جس کی سرائیت فوج اور بالخصوص اس کی درمیانی اور نچلی پرتوں میں ناگزیر ہے۔ باغیوں کے مقاصد جو بھی ہوں ترکی میں، جہاں پہلے بھی چار فوجی بغاوتیں ہو چکی ہوں، ایک نئی جابر فوجی آمریت کی کوئی

باشعور انسان حمایت کبھی بھی نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس طرح کی حکومت محروم ومحکوم عوام کے مسائل کو حل کرسکتی ہے۔لیکن فوجی بغاوت کی مذمت کرنا ایک بات ہے اور اردگان حکومت کو 'جمہوری' قرار دینا نہ صرف احمقانہ بلکہ مجرمانہ عمل تھا۔

چھٹیوں سے سیر سپاٹے کے بعد جب اردگان استنبول پہنچا تو وہ خاصا مشتعل تھا اور انتقام لینے اور اپنی آمرانہ حکومت کو مزید مضبوط کرنے کی بات کررہا تھا۔''ان کو اس کی قیمت چکانی ہوگی۔ یہ فوجی بغاوت خدا کی طرف سے ہمارے لیے ایک تحفہ ہے تاکہ ہم اپنی فوج کی تطہیر کرسکیں''۔ تقریباً تین سو فوجی ہلاک اور اس سے زیادہ زخمی ہوچکے ہیں۔80 ہزار سے زائد لوگوں کو گرفتار اور برطرف کیا گیا ہے جن میں سپاہیوں سے لے کر اعلیٰ افسران بھی شامل تھے۔

اردگان نے 'خدا کے تحفے' سے ضیاالحق کی طرح پوری ریاستی مشینری کو اپنے مفادات کے مطابق ازسرنو ترتیب دے دی اور اس سلسلے میں ہزاروں ججوں اور اساتذہ کو برطرف کیا۔لیکن ایک ریاستی فوج کی کس حد تک تطہیر ممکن ہے؟ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ ان کی جگہ نئے تعینات ہونے والے فوجی افسران ہمیشہ کے لیے وفادار ہوں۔فوجی بغاوت کو جنم دینے والی وجوہات اپنی جگہ موجود رہیں گی۔یہ وجوہات ریاست اور نظام میں موجود ہیں جو ترکی میں زوال کی کیفیت میں ہے۔فتح اللہ گولن، جسے اردگان اس فوجی بغاوت کا سرغنہ قرار دیتا ہے، ایک وقت میں اس کا قریبی اتحادی تھا۔اب وہ اس کا شدید دشمن بن گیا۔تاہم اردگان خود پچھلے چند سالوں میں انتہائی آمرانہ طرز عمل اختیار کرچکا ہے۔اس نے اپنے حکومتی احباب، اپنے ہی تعینات کیے ہوئے اعلیٰ عہدیداروں اور حتیٰ کہ اپنے وفاداروں کو بھی فارغ کیا ہے۔اپنی شخصی آمریت کو مضبوط کرنے کے لیے وہ اس ناکام فوجی بغاوت کو استعمال کررہا ہے۔ترکی سے متعلق تجزیہ نگار انڈریو فنکل نے لکھا ہے،''بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ترکی پہلے سے ہی ایک سست رفتار بغاوت کی زد میں تھا، فوج کی قیادت میں نہیں بلکہ خود اردگان کی قیادت میں۔پچھلے تین سالوں سے وہ ایک خاص طریقے سے طاقت کے سرچشموں پر قبضہ کررہا تھا''۔

اردگان اور اس کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (AKP) کا ابھار بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ ترکی کے حکمران طبقات ایک جدید صنعتی معاشرہ بنانے اور قومی جمہوری انقلاب کے

فرائض انجام دینے میں ناکام رہے ہیں۔ سماجی اور معاشی حالات میں زوال سے ترکی کا سیکولرازم بھی ہوا ہو گیا ہے۔ اردگان کی حکومت کے پہلے نو سالوں میں خواتین کے قتل کی شرح میں 1400 فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس روز افزوں مردانہ بالادستی کے سماج میں اسلامی بنیاد پرست اور قدامت پسند مردانہ شاونسٹ دھڑلے سے غیرت کے نام پر عورتوں کا قتل کر رہے ہیں۔ 2002ء میں حکومت میں آنے کے بعد اردگان نے بیوروکریسی اور ریاست کے اداروں میں ہر حد تک دخل اندازی کی ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے جماعت اسلامی نے ضیاالحق کے گیارہ سالہ تاریک دور میں پاکستان میں کیا اور اس نفرت انگیز اور رجعتی عمل کے نتائج آج بھی ہمیں بنیاد پرستی، رجعت، قدامت پرستی، دہشت گردی اور پراگندگی کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ترکی میں AKP کی حکومت نے تعلیمی نصاب میں رجعت اور مذہبی انتہا پسندی کو شامل کیا ہے تاکہ آنے والی نسلوں کے شعور کو بھی پراگندہ کیا جا سکے۔ بنیاد پرست رجحان رکھنے والوں کو مواقع دیئے جا رہے ہیں کہ وہ سائنسی علم اور قابلیت کے بغیر ہی ملک کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں سکالرشپ لے کر گھسیں اور مراعات حاصل کر کے اہم پوزیشنوں اور عہدوں پر آئیں۔ ہندوستان میں بی جے پی کی حکومت بھی نظام تعلیم اور نصاب کے ساتھ وہی کر رہی ہے جو ترکی میں AKP اور پختونخوا میں جماعت اسلامی اور تحریک انصاف والے کر رہے ہیں۔ اردگان اور اس کے خاندان نے اخبارات اور ٹی وی سٹیشنوں پر تسلط قائم کیا ہے اور انہیں مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ تعصب پھیلانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ چند حقائق ترکی میں سرمایہ داری کے تحت کمال اتاترک کے سیکولر انقلاب کی تاریخی ناکامی کو واضح کرتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا دراصل ایک 'سیکولر جمہوری آمر' تھا۔

ترک کمیونسٹ پارٹی باکو (سوویت یونین) میں 1919ء میں قائم ہوئی۔ ترکی میں اس وقت پہلے سے ہی جنگِ آزادی چل رہی تھی اور ایک بورژوا انقلاب کی طرف بڑھ رہی تھی جس کی قیادت منتشر عثمانی فوج (جسے پہلی جنگ عظیم میں شکست ہو گئی تھی اور فاتحین نے انہیں غیر مسلح کر دیا تھا) کے ینگ آفیسرز کر رہے تھے۔ ترک کمیونسٹوں کی جنگ آزادی میں مداخلت اور نئی ترک ریاست کے قیام کے عمل میں شرکت کی پہلی کوشش جان لیوا ثابت ہوئی۔ جنوری 1921ء میں ترکی کے شمال مشرقی شہر ترابزن میں ترک سرزمین میں داخل ہونے پر ہی کمیونسٹ پارٹی کی تقریباً

پوری قیادت کوختم کر دیا گیا۔ انہی مہینوں کے دوران انقرہ میں نیشنل اسمبلی کا لیڈر (اور ریگولر فوج کا کمانڈر ان چیف) مصطفیٰ کمال کسانوں کی گوریلا فوج کو ختم کرنے میں مصروف تھا جو اس کی حکومت سے آزادانہ طور پر قائم ہوئی تھی تا کہ یونانی قبضہ گیروں اور ان کے مقامی گماشتہ جاگیر داروں کے خلاف لڑ سکے۔

تمام تر وحشیانہ جبر، قیادت کی نظریاتی غداریوں اور غلطیوں کے باوجود پچھلی ایک صدی سے ترکی میں کمیونسٹ اور بائیں بازو کی قوتیں اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دانشور حلقے فوجی بغاوتوں اور سویلین جمہوری حکومت کے بارے میں تو بات کرتے ہیں لیکن کارپوریٹ میڈیا جس چیز کی بات نہیں کرتا وہ ترکی کے محنت کشوں کی طبقاتی جدوجہد کی درخشاں تاریخ اور مزدوروں اور نوجوانوں کی بائیں بازو کی تحریکیں ہیں۔ فوجی آمریتوں اور جمہوری حکومتوں کا ہدف ہمیشہ بایاں بازو، ٹریڈ یونین اور کمیونسٹ تحریکیں رہی ہیں۔ حتیٰ کہ 2013ء کی غیزی پارک کی تحریک اور اردگان کے خلاف ابھرنے والی مختلف تحریکوں میں ہمیشہ کمیونسٹ اور ٹریڈ یونین کے کارکنان ہی پیش پیش رہے ہیں۔ حکومت اور ریاست مخالف مظاہروں اور ریلیوں میں ہمیشہ درانتی ہتھوڑے والے سرخ جھنڈے نمایاں رہے ہیں۔

اگر چہ اردگان کو 'مرد آہن' اور ایک مقبول رہنما کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن فوجی بغاوت کی ناکامی اس کے لئے انتہائی نحیف فتح تھی۔ اس کی جانب سے فوج کی تطہیر کی کوشش سے شدید ردعمل سامنے آئے گا جیسا کہ تاریخ میں اکثر دیکھا گیا ہے۔ رائے عامہ کے اکثر تجزیوں کے مطابق ترکی میں پچاس فیصد سے زائد لوگ اس کے خلاف ہیں۔ اس کا جبر اور روز افزوں وحشیانہ آمریت ناگزیر طور پر ماضی کی تحریکوں کی نسبت کہیں زیادہ بڑی عوامی بغاوت کو جنم دیں گے۔ اردگان حکومت کے خلاف مزاحمت کرنے والے زیادہ تر شہری علاقوں کے محنت کش اور نوجوان ہیں۔ اس حکومت کے اسلامی بنیاد پرستی اور قدامت پرستی کے جبر سے ترک سماج کی باشعور پرتوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ پہلے سے ہی معیشت چند سال پہلے کی 7 فیصد کی شرح نمو سے گر کر 3.8 فیصد پر پہنچ گئی ہے۔ اس سے محرومی اور غربت اور بڑھے گی۔ اپنے اقتدار کے پاگل پن میں اردگان اپنے آقاؤں، یعنی امریکہ اور نیٹو، کو بھی چیلنج کر رہا ہے۔ اردگان کی کیفیت درحقیقت

ضیاالحق کے آخری دنوں سے مماثل ہے جب وہ مادی حقائق سے یکسر کٹ کے افغانستان اور وسط ایشیا میں بھی اپنی 'خلافت' کے خواب دیکھنے لگا تھا اور اپنے امریکی آقاؤں کو آنکھیں دکھاتا تھا۔ عین ممکن ہے اس کا انجام بھی ضیاالحق سے مماثل ہی ہو۔

اردگان اس وقت نیٹو کے فوجی اڈوں کو بند کرنے کی باتیں کر رہا ہے اور ان پر فتح اللہ گولن کو بچانے کا الزام لگا رہا ہے (فتح اللہ گولن اس وقت امریکہ میں جلاوطن ہے)۔ امریکی اور یورپی حکمران صرف وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اردگان کا اگست میں روس کا دورہ اور پیوٹن سے ملاقات اسکی مغرب سے خفا ہونے اور نئی طاقت کا توازن بنانے کی دھمکی کے لیے تھا۔ بحران کی شدت سے سفارتی دنیا میں ہلچل مچا رہی ہے۔ پرانے اتحاد اور معاہدے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں اور وفاداریاں اور اتحاد مسلسل بدل رہے ہیں۔ سامراج کے سنجیدہ تجزیہ نگار پہلے سے اس کا سربڑا ہونے کی باتیں کر رہے ہیں۔ سامراجی پالیسی سازوں کے نزدیک اردگان اب ایک اثاثے کی بجائے بوجھ بنتا جا رہا ہے۔ لیکن مسئلہ صرف اردگان کو ہٹانے کا نہیں ہے۔ اس بوسیدہ نظام کو اس طرح کے 'جمہوری' یا فوجی آمروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن واحد حقیقی قوت جو اس وحشیانہ اقتدار کو اکھاڑ سکتی ہے وہ ترک محنت کشوں کی ایک انقلابی تحریک ہے۔ گزشتہ عرصے میں کئی تحریکیں ابھریں لیکن وہ محدود اور الگ تھلگ تھیں۔ جہاں فوجی حکومتوں نے ترک محنت کشوں پر ظلم اور جبر کے پہاڑ توڑے ہیں، وہیں جمہوری حکومتوں نے اردگان کی آمریت کی شکل اختیار کی ہے جس نے محنت کشوں اور غریبوں کے استحصال اور محرومی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ سرمایہ داری کے تحت مستقبل بھی خوش آئند نہیں ہے۔ لیبیا اور یمن کی طرح ترکی کے نواح میں بھی عراق اور شام کی ریاستیں کم وبیش منہدم ہیں اور ایسے میں ترکی میں بھی استحکام ممکن نہیں ہے۔ ان حالات میں بائیں بازو اور کمیونسٹ قوتوں کا کردار انتہائی اہم ہے کہ وہ ایک متبادل مارکسی انقلابی قوت تعمیر کریں۔ جب ترکی کے محنت کش اور نوجوان جدوجہد کے میدان میں اتریں گے تو ایک انقلابی کیفیت تیزی سے جنم لے گی۔ ایک مارکسی قیادت کی موجودگی میں ایک سوشلسٹ تبدیلی ترکی میں بالکل مادی حقیقت بن سکتی ہے۔ ترک عوام کے سامنے یہی ایک راستہ ہے۔ استنبول میں آبنائے باسفورس ایشیا اور یورپ کو جدا کرتا ہے۔ ترکی کا انقلاب دونوں خطوں میں طبقاتی جدوجہد کو جلا بخشے گا اور دونوں اطراف کے

انقلابات کو جوڑتے ہوئے ایشیا اور یورپ کے محنت کشوں کو یکجا کرے گا۔

پورے مشرق وسطیٰ میں اگر 2011ء کا انقلاب پسپا ہو کر موجودہ نیم بربریت اور آگ اور خون کے ردانقلاب کی شکل اختیار کر سکتا ہے تو موجودہ صورت حال بھی لامتناہی طور پر جاری نہیں رہ سکتی۔ یہ بھی اپنے الٹ میں بدل سکتی ہے۔ ایک نیا انقلابی طوفان ابھر کر سارے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ لیکن یہ انقلابی بغاوت یہاں کہیں زیادہ بلند پیمانے پر ہوگی۔ 2011ء کے انقلاب کی ناکامی کا سب سے بڑا سبق بھی اس نئی انقلابی لہر کی ہراول پرتوں کے سامنے ہوگا کہ تبدیلی صرف سیاسی نظام میں نہیں چاہئے بلکہ نجات کے لیے معیشت، ریاست اور معاشرت کو ایک سوشلسٹ تبدیلی درکار ہے۔ انقلابی مارکسزم کے نظریات میسر آنے پر اس انقلاب کی منزل پورے مشرق وسطیٰ کی ایک رضاکارانہ سوشلسٹ فیڈریشن ہوگی جو عالمی سوشلسٹ انقلاب کا ایک کلیدی مرحلہ بنے گی۔

یورپ

یورپی یونین

2008ء کے مالیاتی کریش کے آٹھ برس بعد بھی مغربی سرمایہ دار معیشتوں میں بحالی کے مسلسل دعوے ناکام اور کھوکھلے ثابت ہو رہے ہیں۔ سماج میں عدم اطمینان اور خلفشار چھوٹی بڑی تحریکوں کی صورت میں مسلسل اپنا اظہار کر رہا ہے۔ اس معاشی بحران کے نتیجے میں معاشی توازن کے بگڑنے سے سیاسی اور سماجی توازن درہم برہم ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کی اصلاح پسندی نامراد ہے کیونکہ اس کی گنجائش تاریخ نے سرمایہ داری میں سے ختم کر دی ہے۔ یورپ کے کئی ممالک میں بحران کے آغاز کے بعد تحریکوں کا ایک طویل عمل شروع ہوا جو اب بھی مختلف ملکوں میں اپنا اظہار کر رہا ہے۔

برطانیہ کی یورپی یونین کی علیحدگی کے ریفرنڈم کے نتائج نے نہ صرف برطانیہ بلکہ پورے یورپی یونین اور اس سے باہر بھی سیاسی اور معاشی طور پر بھونچال برپا کر دیا۔ رائٹرز کے مطابق عالمی سٹاک مارکیٹوں کا حجم ریفرنڈم کے نتائج کے بعد 2 ہزار ارب ڈالر سکڑ گیا۔ اکانومسٹ کے مطابق ''یورپی یونین کے لئے برطانیہ کی علیحدگی ایک تباہی ہے''۔ اکانومسٹ نے صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر برطانیہ میں ایک نئے معاشی بحران (Recession) کا امکان بھی ظاہر کیا ہے۔ اس سال کے آخر تک اگر برطانیہ کی معیشت بحران میں جاتی ہے (جس کا امکان کئی بورژوا معیشت دان ظاہر کر رہے ہیں) تو یورپ کے دوسرے ممالک (بالخصوص جرمنی، فرانس، اٹلی) کی برطانیہ کو برآمدات بھی سکڑیں گی اور یوں برائے نام معاشی بحالی ایک نئے اور زیادہ گہرے بحران میں پورے یورپی یونین کو مبتلا کر سکتی ہے۔ غیر یقینی صورتحال کے پیش نظر برطانوی پاؤنڈ کی قدر میں تیزی سے کمی آئی ہے۔ پاؤنڈ کی قدر ڈالر کے مقابلے میں 11 فیصد کم ہو گئی ہے اور یہ 31 سال کی کم ترین سطح پر چلا گیا ہے۔ کرنسی کی قدر میں کمی عام طور پر برآمدات بڑھانے کا نسخہ سمجھی جاتی ہے لیکن عالمی معیشت اور منڈیوں کی موجودہ کیفیت میں ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔

یورپی یونین کا قیام کئی دہائیوں کے مختلف اقتصادی اور سیاسی معاہدوں کے بعد باقاعدہ طور پر 1992ء میں 'ماستریخت معاہدے' (Maastricht Treaty) کے ذریعے باقاعدہ عمل میں آیا تھا اور اس وقت اس کے رکن ممالک کی تعداد 28 ہے۔ آخری تجزیئے میں یہ وسیع تر منڈیوں تک رسائی کے لئے یورپی بورژوازی کی ایک کوشش تھی، لیکن اس کی بنیاد تضادات سے بھرپور تھی۔ مختلف سمت میں سفر کرتی ہوئی اور مختلف کیفیات کی حامل سرمایہ دارانہ معیشتوں اور سیاسی اکائیوں کو ایک منڈی میں اور اس سے بھی بڑھ کر ایک کرنسی میں جوڑنا عملی طور پر ناممکن ہے۔ مشترکہ منڈی کا فائدہ آخری تجزیئے میں طاقتور سرمایہ دار کو ہی ہوتا ہے جو بالآخر چھوٹے سرمایہ دار کو کھا جاتا ہے یا پھر دیوالیہ کر کے منڈی سے نکال باہر کرتا ہے۔ معاشی غلبہ ہی سیاسی طاقت کی بنیاد بنتا ہے۔ یہ صورتحال آج ہمیں یورپی یونین میں بالکل واضح نظر آتی ہے جس کے حتمی شراکت دار اور فیصلہ ساز جرمنی اور کسی حد تک فرانس کے سرمایہ دار ہیں جبکہ یونان، پرتگال حتیٰ کہ اٹلی اور سپین جیسے 'چھوٹے' یا تکنیکی و اقتصادی طور پر پسماندہ ممالک معاشی طور پر دیوالیہ (یا اس طرف گامزن) ہو کر ان کی نوآبادیات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

جب تک عالمی معیشت آگے بڑھ رہی تھی (اگرچہ قرضوں وغیرہ کی مصنوعی بنیادوں پر) تب تک 'سب اچھا تھا' لیکن سرمایہ داری کی عمومی زوال پذیری، تاریخی متروکیت اور نامیاتی بحران کی موجودہ کیفیت میں یورپی یونین میں موجود تمام تر تضادات اب منظر عام پر آ رہے ہیں۔ ماستریخت معاہدے کی بنیادی شرائط میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کوئی رکن ملک اپنے ریاستی قرضے کو جی ڈی پی کے 60 فیصد سے تجاوز نہیں کرنے دے گا۔ آج یورپی یونین کا کوئی ملک اس شرط پر پورا نہیں اترتا۔ مجموعی طور پر پوری یورپی یونین کا ریاستی قرضہ 2008ء میں جی ڈی پی کے 61 فیصد سے بڑھ کر اس وقت 86 فیصد ہو چکا ہے۔ سپین کا ریاستی قرضہ 2008ء میں 39 فیصد سے 2015ء میں 99 فیصد اور اسی عرصے میں اٹلی کا 102 فیصد سے 133 فیصد، برطانیہ کا 51 فیصد سے 82 فیصد، فرانس کا 68 فیصد سے 95 فیصد اور جرمنی کا 65 فیصد سے 74 فیصد ہو چکا ہے۔ یہ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک کے بڑھتے ہوئے معاشی بحران اور مستقبل کے تناظر کی ایک واضح جھلک ہے۔ اسی طرح ماستریخت معاہدے کی بنیادی شرط تھی کہ رکن ممالک کا بجٹ خسارہ جی ڈی

پی کے 3 فیصد سے تجاوز نہیں کرے گا لیکن اس شرط کی خلاف ورزی ایک معمول ہے۔ مثلاً 2016ء میں معاشی طور پر یورپی یونین کے پانچ سب سے بڑے ممالک میں سے تین (برطانیہ، فرانس، سپین) کا بجٹ خسارہ 3 فیصد سے زیادہ تھا، یونان، فن لینڈ، پولینڈ جیسے چھوٹے ممالک اس کے علاوہ ہیں۔ مختصراً یہ کہ جن بنیادوں پر یورپ کو ایک معاشی اکائی بنانے کا خواب یورپی بورژوازی نے دیکھا تھا آج وہ کھوکھلی ہو چکی ہے، نتیجتاً پورا ڈھانچہ لڑکھڑا رہا ہے۔ یورپی یونین کا مستقبل مخدوش ہوتا جا رہا ہے۔

فرانس

فرانس میں جاری ہڑتال اور مظاہروں کے سلسلے سے ''سوشلسٹ پارٹی'' کی حکومت پر دباؤ شدید ہو چکا ہے جو کٹوتیوں (آسٹیریٹی) کے خلاف ووٹ لے کر برسر اقتدار آئی تھی اور اب اپنے ووٹروں سے غداری کر رہی ہے۔ کیا المیہ ہے کہ اسی حکومت نے مزدور دشمن 'لیبر اصلاحات کا قانون' نافذ کیا ہے۔ پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم مینوئل والز نے اس قانون کے خلاف ہڑتالوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا ''ایک ایسے وقت پر جب حکومتی اقدامات کے نتیجے میں معیشت بحال ہو رہی ہے اور بڑھ رہی ہے اور بے روزگاری میں کمی واقع ہو رہی ہے، یہ تنازعہ ہماری معیشت پر ایک بوجھ ہے''۔ صدر ہولاند کی سوشلسٹ پارٹی کی حکومت کے مطابق اس نئے لیبر قانون کا مقصد مسلسل بلند شرح کی بے روزگاری میں کمی اور مشکلات سے دوچار معیشت کو کاروبار کے لیے مزید ''سازگار'' بنانا ہے۔ یورو 2016ء فٹ بال ٹورنامنٹ سے صرف نو روز قبل یکم جون کو فرانس میں ریلوے کے محنت کش ہڑتال پر چلے گئے۔ یہ حکومت اور یونینز کے درمیان کئی ماہ سے جاری لڑائی کا حصہ تھا۔ تین ماہ سے بھی کم عرصے میں یہ ریلوے کمپنی ایس این سی ایف کی آٹھویں ہڑتال تھی جس سے ملک بھر میں تقریباً آدھی ریل گاڑیاں جام ہو گئیں۔

نام نہاد بائیں بازو کی جانب سے کٹوتیوں کی ان پالیسیوں اور مزدور دشمن اقدامات سے دائیں بازو کے سیاست دانوں کو حملے کرنے کا موقع مل گیا۔ دائیں بازو کے حزب اختلاف کے لیڈر اور سابقہ صدر نکولس سارکوزی نے اس بحران میں حکومت کے کردار کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے

جریدے والیرس ایکچولس (Valeurs Actuelles) کو دیئے گئے انٹرویو میں کہا کہ ''فرانس کی سڑکوں پر ہنگامہ خیزی اور انتشار ہے... اتھارٹی مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے اور (حکومت) کمزور اور بزدل ہے۔ یہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے... یہ قانون مسائل کا حل کرنے کے لیے بہت کمزور، لیکن بائیں بازو کے جوش کو ابھارنے کے لیے کافی ہے۔ حکومت کی کمزوری ثابت ہو چکی ہے اور اسے مظاہروں کا سامنا ہے''۔

اس قانون کے تحت مالکان کے لئے ملازمین کو نکالنا آسان ہو جائے گا اور مستقل روزگار پر ضرب لگے گی۔ یونینز کے مطابق یہ قانون مالکان کے فائدے میں ہے کیونکہ وہ نئے ملازمین کے ساتھ متعلقہ شعبے پر لاگو سمجھوتوں کی بجائے من مانی شرائط طے کر سکیں گے۔ اس سے کمپنیاں بوقت ضرورت نوکریاں ختم کرنے اور فرانس کے ہفتہ وار 35 گھنٹے اوقات کار سے زیادہ کام لینے کے قابل ہو جائیں گی۔ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد فرانسیسی محنت کشوں پر ریاست اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کا طبقاتی کردار زیادہ واضح ہوگا اور اس فریب کو استعمال کرتے ہوئے تحریکوں کو زائل کرنا اب حکمرانوں کے لئے اتنا آسان نہیں رہے گا۔ وقتی پسپائی کے بعد فرانس کے نوجوان اور محنت کش بہت جلد دوبارہ میدان میں اتریں گے۔

کچھ عرصے سے فرانسیسی سیاست دائیں اور بائیں جانب جھول رہی ہے۔ فرانس میں دہشت گردی کی حالیہ کاروائیوں اور مشرق وسطیٰ سے تارکین وطن کے دباؤ نے بھی قوم پرستوں اور فسطائی رجحانات کو رجعتی سیاست کے ایشوز فراہم کئے ہیں۔ بورژوا میڈیا نے مقامی اور علاقائی انتخابات میں انتہائی دائیں بازو کے 'نیشنل فرنٹ' کی کامیابی کو فرانس میں دائیں بازو کی جانب ایک تبدیلی قرار دیا تھا۔ تاہم مسلسل مظاہروں اور ہڑتالوں کی تحریک سے فرانسیسی نوجوانوں اور پرولتاریہ کی قوت اور ثابت قدمی واضح ہے۔ دہشتگردی کی کاروائیوں کو جواز بنا کر فرانسیسی حکومت نے نومبر 2015ء سے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر رکھی ہے۔ اس کو استعمال کرتے ہوئے فرانسیسی ریاست اور حکمران طبقہ محنت کشوں پر وار کر رہا ہے اور بنیادی انسانی حقوق پامال کیے جا رہے ہیں۔ مارکس اور اینگلز نے فرانس کو ''انقلابات کی ماں'' کہا تھا۔ پرولتاریہ کا پہلا انقلاب پیرس کمیون تھا جب 15 مارچ سے 28 مئی 1871ء تک اقتدار محنت کشوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ

طبقاتی جدوجہد کی تاریخ کا اہم سنگ میل تھا۔ اسی طرح فرانس میں مئی 1968ء کا انقلاب ایک عظیم انقلابی بغاوت تھا جو کامیاب ہو کر تاریخ بدل سکتا تھا۔ بدقسمتی سے یہ انقلاب قیادت کی نااہلی اور غداری کی نذر ہو گیا۔ آج ایک بار پھر فرانس کے محنت کش اور نوجوان میدان عمل میں اتر رہے ہیں۔ حالیہ بحران کے عرصے میں انہوں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور دوررس نتائج اخذ کئے ہیں۔ لیکن آج بھی انہیں ایک مارکسی قیادت درکار ہے۔ ایک انقلابی قیادت کے تحت فرانس کا انقلاب نہ صرف یورپ کو بدل کر رکھ دے گا بلکہ ساری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف انقلابی بغاوتوں کو بھڑکانے والی چنگاری ثابت ہوگا۔

برطانیہ

ستمبر 2015 میں لیبر پارٹی کی قیادت کے لیے جیرمی کوربن کی شاندار فتح برطانوی سیاست میں ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ یہ ایک بہت بڑا سیاسی بھونچال ہے۔ منجھے ہوئے لیبر سیاست دان مائیکل میچر نے درست کہا ہے کہ کاربن کی مہم ''سماجی نظام میں سب سے بڑی انقلاب کے بغیر تبدیلی ہے''۔ یہ امید کا ایک پیغام ہے جو صرف برطانیہ اور یورپ کے محنت کشوں اور نوجوانوں تک محدود نہیں۔ یہ اسٹیبلشمنٹ اور اسکے دائیں بازو کے امیدواروں کی شکست فاش ہے۔ لوگوں نے ایک بنیادی تبدیلی کے حق میں فیصلہ دیا ہے جو لندن شہر کے سرمایہ داروں اور بینکاروں کے لیے آنے والے انقلابی حالات کی ایک چیتاؤنی ہے۔ ابتدا میں کسی کو بھی جیرمی کی فتح کی توقع نہیں تھی۔ یہ سماج میں سلگنے والے غصے اور تکلیف کا اظہار ہے جو 9-2008ء کے معاشی بحران کے بعد بہت شدید ہو چکا ہے۔

پارٹی انتخابات سے چند ماہ قبل ہی یہ سمجھا جا رہا تھا کہ جیرمی کاربن کے جیتنے کے کوئی امید نہیں ہے اور امیدواروں میں اسکا نام صرف ''بحث کا دائرہ وسیع'' کرنے کی خاطر شامل کیا گیا تھا۔ لیبر پارٹی کے دائیں بازو کے لیڈروں کا خیال تھا کہ وہ ووٹنگ کے پہلے ہی مرحلے میں باہر ہو جائے گا۔ اب وہ کتنا پچھتا رہے ہیں۔ لیبر پارٹی کی اسٹیبلشمنٹ، غفلت میں اپنے آقاؤں کے پراپیگنڈے پر یقین کر بیٹھی تھی کہ سوشلزم مر چکا ہے اور بائیں بازو کے نظریات غیر مقبول ہو چکے ہیں۔

لیبر پارٹی کے انتخابات کے نتائج کے بعد سوشلزم پھر سے برطانوی سیاست کے ایجنڈے پر آچکا ہے۔ جرمی نے اپنا شیڈو وزیر خزانہ جان میکڈونل کو نامزد کیا ہے جس کی پہچان ہی یہ نعرہ ہے کہ ''سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکو۔''

فنانشل ٹائمز نے اسے ''عوامی بغاوت'' قرار دیتے ہوئے لکھا: ''کسی اور عہد میں 2008ء کے بحران سے انقلاب جنم لے چکا ہوتا۔ اس کی بجائے اب مسٹر کاربن اور ان کے ساتھی عوام کے سلگتے ہوئے غصے کا اظہار بن گئے ہیں... آزاد منڈی کے ثمرات اوپر کے ایک فیصد تک محدود رکھنے اور باقی لوگوں پر کٹوتیوں اور عدم تحفظ کا بوجھ ڈالنے والی بے لگام سرمایہ داری سیاسی طور پر نا پائیدار ہے۔''

جیرمی کاربن کی قیادت میں لیبر پارٹی کی پہلے علاقائی انتخابات میں کامیابی نے تمام تجزیوں کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ انتخابات سے پہلے پارٹی اور پارٹی کے باہر موجود دایاں بازو بلند دعوے کر رہا تھا کہ جیرمی کاربن کی پالیسیوں کی وجہ سے لیبر پارٹی کمزور ہو چکی ہے اس وجہ سے علاقائی انتخابات میں چند ایک سیٹوں کے علاوہ زیادہ تر سیٹیں کھو دے گی۔ لیکن تمام اندرونی اور بیرونی مخالفت کے باوجود لیبر پارٹی کی فتح نے جیرمی کاربن کی قیادت کو مزید مضبوط کرنے میں مدد دی۔ انتخابات کے نتائج کے بعد پارٹی کے دائیں بازو کو وقتی طور پر شکست کا سامنا ہوا ہے لیکن وہ مسلسل کاربن کے خلاف اقدامات کرنے میں مصروف عمل رہے۔

3 جون کو برطانیہ (United Kingdom) میں ہونے والے ریفرنڈم میں اکثریت نے یورپی یونین سے علیحدگی کا ووٹ دیا ہے۔ ریفرنڈم کے بیلٹ پیپر پر سوال پوچھا گیا تھا کہ ''کیا برطانیہ کو یورپی یونین کا ممبر رہنا چاہئے یا یورپی یونین کو چھوڑ دینا چاہئے؟'' ریفرنڈم کا نتیجہ نہ صرف برطانیہ بلکہ دنیا بھر کے سیاسی تجزیہ نگاروں کے لئے خاصا غیر متوقع تھا۔ آخری وقت تک پیش گوئی کی جا رہی تھی کہ اگرچہ تھوڑے مارجن سے ہی سہی لیکن اکثریت یورپی یونین میں رہنے کا فیصلہ کرے گی تاہم نتیجہ اس کے برعکس رہا۔ 52 فیصد لوگوں نے یورپی یونین سے علیحدگی جبکہ 48 فیصد نے یورپی یونین میں رہنے کے حق میں ووٹ دیا۔ ٹرن آؤٹ بھی غیر متوقع طور پر زیادہ رہا۔ ووٹ ڈالنے کے اہل 71.8 فیصد افراد نے ووٹ ڈالے جن کی کل تعداد تقریباً 3 کروڑ بنتی ہے۔

یہ برطانیہ میں 1992ء کے عام انتخابات کے بعد سب سے زیادہ ٹرن آؤٹ تھا۔ برطانیہ یورپی یونین سے نکلنے والا پہلا ملک بن جائے گا۔

ریفرنڈم کے حتمی نتائج آنے کے بعد برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون (جو یورپی یونین کے ساتھ رہنے کی مہم چلا رہا تھا) مستعفی ہوگیا۔ کارپوریٹ میڈیا پر ہر جگہ ڈیوڈ کیمرون کو ناکام جواری قرار دیا گیا۔ ڈیوڈ کیمرون نے اس ریفرنڈم کا اعلان ایک جوا سمجھ کر انتہائی دائیں بازو کی قوم پرست اور یورپی یونین مخالف 'یوکے انڈ پنڈنٹ پارٹی' (UKIP) کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا مقابلہ کرنے اور اپنی ساکھ میں اضافے کے لئے کروایا تھا اور اسے امید تھی کہ 2014ء کے سکاٹش ریفرنڈم کی طرح اس بار بھی اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرلے گا لیکن الٹ نتیجہ برآمد ہوا۔ کنزرویٹو پارٹی کے 185 ممبران پارلیمنٹ یورپی یونین میں رہنے کے حق میں مہم چلا رہے تھے۔ نئی وزیراعظم تھریسامے یورپی یونین کی شدید مخالف اور انتہائی رجعتی ہے۔

جیری کاربن کی قیادت میں لیبر پارٹی نے بھی یورپی یونین میں رہنے کی مہم چلائی تھی لیکن علیحدگی کے ووٹ کی کامیابی کو لیبر پارٹی کا دایاں بازو جیری کاربن کی کمزوری اور ناکامی قرار دے کر ان کے استعفے کا مطالبہ کرتا رہا لیکن انہیں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ لیبر پارٹی میں مسلسل دائیں اور بائیں بازو کی لڑائی جاری ہے۔ دائیں بازو نے ریفرنڈم میں علیحدگی کے ووٹ کو جرمی کاربن کے خلاف خوب استعمال کیا اور اسے قیادت سے ہٹانے کا ہر قانونی و غیر قانونی حربہ استعمال کیا گیا۔ آخر کار نوبت پارٹی میں دوبارہ انتخابات تک جا پہنچی جو 24 ستمبر کو ہو رہے ہیں۔ ان انتخابات میں جرمی کاربن کا مقابلہ ''سافٹ لیفٹ'' کے امیدوار 'اوون سمتھ' سے ہے۔ جرمی کاربن کے مقابلے میں دائیں بازو نے اوون سمتھ کا انتخاب بہت عیاری سے کیا ہے اور وہ خود کو 'بائیں بازو' کا نمائندہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کٹوتیاں مخالف لفاظی بھی وقتاً فوقتاً کرتا ہے۔ یہ درحقیقت دائیں بازو کی زہریلی چال ہے تاکہ کاربن کے گرد پارٹی کے اندر اور باہر جنم لینے والی تحریک کو بھٹکایا جاسکے۔ 24 ستمبر کے پارٹی انتخابات بہت اہم ہیں اور قوی امکانات ہیں کہ دائیں بازو کو پچھلے انتخابات کی طرح ہزیمت ہی اٹھانی پڑے گی۔ پارلیمانی پارٹی کی اکثریت دائیں بازو اور ''بلیرائیٹز'' پر مبنی ہے۔ شکست کی صورت میں وہ علیحدہ بلاک بنانے کی طرف جاسکتے

ہیں جس سے پھر پارٹی میں ایک پھوٹ جنم لے گی۔ کاربن کی قیادت میں عام کارکنان اور ٹریڈ یونینز پر مبنی یہ پارٹی ایک ریڈیکل بائیں بازو کی پارٹی بن سکتی ہے۔ اس کے اثرات پورے یورپ میں سیاسی ریڈیکلائزیشن کو جنم دیں گے۔

یورپی یونین سے متعلق ریفرنڈم نے بہت سے دوسرے مضمرات اور نتائج کے علاوہ برطانیہ کے اندر موجود دراڑوں کو بھی ایک بار پھر واضح کر دیا ہے اور قومی تضادات پھر سے بھڑک اٹھے ہیں۔ مثلاً انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ میں یورپی یونین سے متعلق متضاد آرا سامنے آئی ہیں۔ اس کے بعد سکاٹ لینڈ کی برطانیہ سے علیحدگی کے امکانات پھر سے بڑھ گئے ہیں اور سکاٹ لینڈ میں برطانیہ کے ساتھ رہنے یا علیحدہ ہونے سے متعلق ایک اور ریفرنڈم کی بات کی جا رہی ہے۔ یاد رہے کہ ستمبر 2014ء کے سکاٹش ریفرنڈم میں 44 فیصد افراد نے برطانیہ سے علیحدگی کا ووٹ دیا تھا، ایسا کوئی ریفرنڈم اگر دوبارہ ہوتا ہے تو واضح امکانات ہیں کہ اکثریت علیحدگی کا ووٹ دے گی۔ ایسی ہی صورتحال شمالی آئرلینڈ میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

برطانیہ میں دائیں بازو کے نسل پرست، قوم پرست اور مہاجرین مخالف (Anti Immigration) سیاسی رجحانات نے ریفرنڈم کے نتائج کو اپنی فتح سے تعبیر کیا۔ قوم پرست 'یو کے انڈپنڈنٹ پارٹی' کے سربراہ نائجل فراژ نے 23 جون کو ''برطانیہ کے یوم آزادی'' سے تعبیر کیا اور کہا کہ ''یورپی یونین ناکام ہو رہی ہے، یہ مر رہی ہے''۔ نہ صرف برطانیہ بلکہ پورے یورپ میں یورپی یونین اور مہاجرین مخالف انتہائی دائیں بازو کی پارٹیوں کو ان نتائج سے تقویت ملی ہے اور آنے والے دنوں میں قوم پرستوں کی جانب سے دوسرے ممالک میں بھی ایسے ریفرنڈم کے مطالبات اٹھیں گے جس سے یورپی یونین میں عدم استحکام اور انتشار بڑھے گا۔ یہ صورتحال یورپی یونین کے حقیقی آقاؤں یعنی جرمنی کے حکمرانوں کے لئے خاصی پریشان کن ہے۔ مثلاً PEW کے تازہ سروے کے مطابق فرانس کی 61 فیصد آبادی یورپی یونین کے بارے میں 'غیر مثبت' خیالات رکھتی ہے۔ فرانس میں انتہائی دائیں بازو کی 'نیشنل فرنٹ' پارٹی کی مقبولیت گزشتہ کچھ عرصے میں تیزی سے بڑھی ہے جو یورپی یونین سے علیحدگی چاہتی ہے۔ جرمنی اور فرانس کے بد ترین معاشی جبر، بلکہ معاشی دہشت گردی کے شکار یونان جیسے ممالک میں صورتحال کا اندازہ لگانا

مشکل نہیں ہے۔

برطانیہ کی کل برآمدات کا نصف یورپی یونین کے ممالک میں فروخت ہوتا ہے اور یورپی یونین سے علیحدگی کا مطلب ہے کہ یورپ کی مشترکہ مارکیٹ (Single Market) میں برطانیہ اپنی مصنوعات اب پہلے کی طرح بغیر کسی رکاوٹ کے فروخت نہیں کر سکے گا (یورپی یونین سے باقاعدہ علیحدگی کی صورت میں)۔ برطانیہ کی مصنوعات درآمد کرنے والے ممالک اب ان مصنوعات پر ڈیوٹی عائد کر سکیں گے۔ یورپی یونین کی سنگل مارکیٹ 50 کروڑ صارفین پر مبنی دنیا کا سب سے بڑا تجارتی زون ہے لیکن اس تک رسائی کے لئے یورپی یونین کا ممبر ہونا ضروری ہے، مثلاً اپنے ملک میں دوسرے یورپی ممالک کے شہریوں کو بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت دینا پڑتی ہے، رکن ممالک کی مصنوعات کو اپنی منڈی دینا پڑتی ہے اور یورپی یونین کے بجٹ میں حصہ ڈالنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یورپی یونین کے 53 ممالک سے آزادانہ تجارت کے معاہدوں (بشمول کینیڈا، سنگاپور، جنوبی کوریا وغیرہ) سے بھی برطانیہ باہر ہو جائے گا اور اسے ان ممالک سے اپنے طور پر معاہدے کرنا ہوں گے۔ لیکن جہاں یورپی منڈی تک برطانیہ کی رسائی میں مشکلات آئیں گی وہاں فرانس اور جرمنی جیسے بڑے صنعتی ممالک کو بھی برطانیہ کی منڈی تک رسائی میں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ برطانیہ اس وقت فرانس کی خوراک اور جرمنی کی گاڑیوں کی بڑی منڈی ہے۔ اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ یورپی یونین کی مشترکہ مارکیٹ میں برطانیہ کی مشروط اور محدود شمولیت برقرار رکھی جائے۔ برطانیہ کے جی ڈی پی میں مینوفیکچرنگ کا حصہ 1970ء میں 32 فیصد سے سکڑ کر آج 11 فیصد ہو چکا ہے۔ جب کہ جرمنی کے جی ڈی پی میں یہ شرح 23 فیصد ہے اور گزشتہ کئی دہائیوں سے اسی سطح پر قائم ہے۔ جرمنی کو اپنی طاقتور مینوفیکچرنگ کی صنعت کی برآمدات کے لئے منڈی بہرحال درکار ہے اور وہ ہر صورت میں یورپی مشترکہ مارکیٹ کو برقرار رکھنا چاہے گا۔

برطانیہ میں کام کرنے والے دوسرے یورپی ممالک کے محنت کشوں اور ان ممالک میں کام کرنے والے برطانیہ کے محنت کشوں کا مستقبل بھی غیر یقینی صورتحال سے دوچار ہو گیا ہے۔ فی الوقت برطانیہ میں دوسرے یورپی ممالک کے 22 لاکھ باشندے آباد ہیں اور تقریباً اتنی ہی تعداد

میں برطانیہ کے شہری دوسرے یورپی ممالک میں کام کر رہے ہیں۔ اگر برطانیہ میں رہنے والے دوسرے یورپی ممالک کے شہریوں پر ورک پرمٹ کی پابندی لگائی جاتی ہے تو عین ممکن ہے کہ دوسرے ممالک بھی جواب میں ایسی پابندیاں عائد کریں گے، اس کا مطلب ہے کہ برطانیہ کے شہریوں کو دوسرے یورپی ممالک میں کام کرنے کے لئے ویزا لینا پڑے گا۔ تاہم یورپ کے علاوہ دوسرے ممالک، بالخصوص تیسری دنیا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے مہاجرین اور پناہ گزینوں سے متعلق برطانیہ کی ریاست فوری طور پر سخت رویہ اپنا سکتی ہے اور عین ممکن ہے ایسا کیا بھی جائے گا۔

تاہم لیبر پارٹی میں جرمی کاربن کے گرد ریڈیکل بائیں بازو کا ابھار ایک ایسی پیش رفت ہے جو برطانوی سیاست اور طبقاتی کشمکش پر گہرے اثرات مرتب کر رہی ہے۔ فی الحال یہ لڑائی زیادہ تر لیبر پارٹی کے اندر جاری ہے لیکن ناگزیر طور پر آنے والے عرصے میں زیادہ کھل کر پوری برطانوی سیاست کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کر دے گی اور بلند تر پیمانے پر برطانیہ میں طبقاتی لڑائی کا آغاز ہوگا۔

یونان

2008ء کے مالیاتی کریش سے شروع ہونے والے عالمگیر معاشی بحران میں یونان کی سنگین معاشی اور سماجی صورتحال واضح کرتی ہے کہ یورپی سرمایہ داری کس گہرے بحران سے دوچار ہے اور اس کی قیمت محنت کش طبقے سے وصول کرنے کے لئے کس حد تک ڈھٹائی اور وحشت پر اتر سکتی ہے۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو گزشتہ آٹھ سالوں میں غیر اعلانیہ دیوالیے کے بعد جرمنی اور فرانس کے حکمرانوں کی ایما پر یورپی کمیشن (EC)، یورپی سنٹرل بینک (ECB) اور آئی ایم ایف نے یونان کو نوچ ڈالا ہے اور کٹوتیوں کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ یونان کا بحران ختم نہیں ہوا بلکہ منظر عام سے غائب کر دیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ آسٹیریٹی مخالف نعروں پر برسر اقتدار آنے والی سائریزا کی غداری اور تحریک کی وقتی پسپائی بھی ہے۔ لیکن تمام تر تضادات نہ صرف موجود ہیں بلکہ گزشتہ عرصے میں شدید تر ہوئے ہیں اور بدترین کٹوتیوں کے باوجود یونان کے قرضے میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ 2006ء میں یونان کا ریاستی قرضہ جی ڈی پی کے 103 فیصد کے مساوی تھا۔

2008ء میں عالمی معاشی بحران کے آغاز پر یہ تقریباً 110 فیصد تھا جو صرف دو سال بعد 2010ء میں 146 فیصد تک جا پہنچا۔ یورپ کے قرضوں کا بحران (European Debt Crisis) اسی وقت شروع ہوا۔ گزشتہ سالوں میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس وقت یونان کا ریاستی قرضہ جی ڈی پی کے 180 فیصد کو چھو رہا ہے۔ سرمایہ داری کے تحت یونان کے بحران کا کوئی حل موجود نہیں ہے اور ایک کروڑ دس لاکھ آبادی کا یہ سماج برباد ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یونان کا بحران درحقیقت سرمایہ داری کے عالمی بحران کا ہی ایک پہلو اور ناگزیر نتیجہ ہے اور اس سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں پرتگال، سپین، اٹلی اور برطانیہ وغیرہ جیسے کئی دوسرے یورپی ممالک گامزن ہیں۔ بنیادی طور پر یہ قرضوں کا بحران ہے اور قرض کے ذریعے سرمایہ داری کو مصنوعی طور پر کئی دہائیوں تک چلانے کا منطقی انجام ہے۔ 1981ء میں یونان کا ریاستی قرضہ جی ڈی پی کا صرف 26 فیصد تھا جو 1992ء میں 80 فیصد اور 1995ء تک 100 فیصد سے تجاوز کر چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں یونان کی معیشت اور معاشی نمو زیادہ تر ریاستی اخراجات (Public Spending) پر منحصر رہی جن کی بنیاد قرضہ تھا۔ علاوہ ازیں یونان کی تکنیکی طور پر پسماندہ اور تاریخی طور پر تاخیر زدہ سرمایہ داری ہمیشہ سے ریاستی سبسڈی کی محتاج رہی ہے اور ٹیکسوں کے ذریعے ریاستی آمدن میں اضافے کرنے کی بجائے یونان کے سرمایہ دار روایتی طور پر ٹیکس چور رہے ہیں۔ 1999ء میں یورو زون کا حصہ بننے سے قبل یونان میں قرض کی لاگت (سود اور دوسری مدوں میں قرض کی رقم پر اضافی ادائیگی) اوسطاً 20 فیصد سے زیادہ تھی جو کہ یورو متعارف ہونے کے بعد تیزی سے کم ہوئی اور 2003ء تک یہ شرح 6.8 فیصد تک گر چکی تھی۔ سستے قرضوں کے ذریعے معاشی 'بوم' کے عہد میں کھپت اور سرمایہ کاری میں خوب اضافہ کیا گیا۔ جرمنی کے سرمایہ دار اس عہد میں یونان کی پھیلتی ہوئی منڈی سے خوب استفادہ حاصل کرتے رہے اور اپنا مال یہاں کھپاتے رہے۔ واضح رہے کہ یونان کو قرض دینے والوں میں بھی سرفہرست جرمنی اور پھر فرانس کے بینک ہی تھے۔ 1999ء سے 2008ء تک یونان کے نجی شعبے کا قرضہ جی ڈی پی کے 59 فیصد سے بڑھ کر 126ء فیصد تک جا پہنچا۔ اسی عرصے میں حکومت کا قرضہ 100 فیصد کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ بڑے پیمانے پر درآمدات نے بڑے تجارتی خسارے کو جنم دیا۔ 1995ء تک

یونان کا تجارتی خسارہ صفر تھا جو کہ 1999ء میں جی ڈی پی کے چار فیصد اور 2008ء میں 15 فیصد تک پہنچ چکا تھا۔ یہ تجارتی خسارہ یورپی یونین میں یونان کی سرمایہ داری کی کمزوری کو بھی عیاں کرتا ہے۔ یہ تمام تر تجارتی خسارہ قرضوں کے ذریعے پورا کیا جاتا رہا۔ 2008ء تک یونان کا ریاستی اور نجی قرضہ پہلے ہی خطرناک حدود سے بھی آگے جا چکا تھا۔ 2008ء میں مالیاتی کریش کے بعد جب عالمی معیشت کی زوال پزیری کا آغاز ہوا تو اس قرض کی واپسی رفتہ رفتہ مشکل ہوتی چلی گئی۔ بینکوں کے ناقابل واپسی قرضے (Bad Debts) 2008ء میں کل قرضوں کے 4 فیصد سے 2014ء میں 34 فیصد تک جا پہنچے۔ ایک طرف نجی شعبہ قرضوں کی واپسی میں مشکلات سے دوچار تھا اور دوسری طرف بحران کے تحت منڈی سکڑتی چلی گئی اور یوں ایک گھن چکر میں معیشت پھنس گئی۔ کم ہوتی ہوئی کھپت کے پیش نظر کاروبار خسارے سے دوچار ہوئے تو نوکریوں کے خاتمے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یونان میں بیروزگاری کی شرح 2008ء میں 7.3 فیصد سے بڑھتے بڑھتے 25 فیصد تک جا پہنچی۔ بڑھتی ہوئی بیروزگاری کا مطلب سوشل سروسز (بیروزگاری الاؤنس وغیرہ) کے مد میں ریاست کے اخراجات میں اضافہ اور ٹیکسوں میں اسی شرح سے کمی تھا۔ علاوہ ازیں بڑھتے ہوئے ناقابل واپسی قرضوں کے پیش نظر بینک دیوالیے کے دہانے پر تھے جنہیں بچانے کے لئے ریاستی بیل آؤٹس دیئے گئے۔ یوں ریاست کا بجٹ خسارہ بڑھنے لگا اور 2007ء میں جی ڈی پی کے 5.7 فیصد سے بڑھ کر صرف دو سال میں 16 فیصد تک جا پہنچا۔ اس بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لئے مزید قرض لیا گیا اور ریاست قرضے کے نیچے دبتی چلی گئی جو اب ناقابل ادا حد تک پہنچ چکا ہے۔

2008ء کے بعد بہت تھوڑے وقفوں کے استثنا کے علاوہ یونان کی معیشت کی شرح نمو منفی میں رہی ہے یعنی معیشت مسلسل سکڑ رہی ہے۔ 2008ء میں جی ڈی پی 354 ارب ڈالر تھا جو 2016ء کے آغاز میں 195 ارب ڈالر تک گر چکا ہے۔ یہ تقریباً 45 فیصد کا سکڑاؤ ہے جس کا موازنہ کسی بڑی جنگ میں پیداواری قوتوں کی تباہی سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ 2016ء کے پہلے چھ ماہ میں بھی معیشت مزید سکڑی ہے اور یہی رجحان آگے جاری رہنے کا امکان ہے۔ اس معاشی گراوٹ کی ایک بنیادی وجہ قرضے کو کم کرنے کے لئے کی جانے والی 'آسٹیریٹی' یا حکومتی اخراجات

میں کٹوتیاں اور بالواسطہ ٹیکسوں میں اضافہ ہے جس کی وجہ سے قوت خرید تیزی سے گری ہے اور نتیجتاً معیشت سکڑ رہی ہے۔ معیشت کا یہ سکڑاؤ قرض ادا کرنے کی رہی سہی صلاحیت کو بھی ختم کر رہا ہے اور آسٹیریٹی نے بحران کو زیادہ سنگین اور پیچیدہ ہی کیا ہے۔ یوں کئی دہائیوں تک معیشت کو مصنوعی طور پر آگے بڑھانے والے عامل سے جدلیاتی طور پر اپنے الٹ میں بدل کر قرضے معیشت پر دیوہیکل بوجھ بن چکے ہیں۔ فروری 2010ء سے لے کر مئی 2016ء تک یونان کی حکومتیں آئی ایم ایف اور یورپی مالیاتی اداروں کے احکامات کو بجالاتے ہوئے 16 'آسٹیریٹی پیکج' نافذ کر چکی ہیں جو عوام کو زندہ درگور کرنے کے مترادف ہے۔ تعلیم، علاج، پنشن، بیروزگاری الاؤنس وغیرہ کی سہولیات کو بے دردی سے ختم کیا جا رہا ہے جبکہ بالواسطہ ٹیکسوں میں تیز اضافہ کیا جا رہا ہے۔ مئی 2016ء کے آسٹیریٹی پیکج کے تحت تقریباً تمام ریٹائرڈ ملازمین کی پنشن میں مزید کٹوتیاں لگائی گئی ہیں جبکہ ویلیو ایڈڈ ٹیکس (VAT) کو 24 فیصد تک بڑھا دیا گیا ہے۔ دو لاکھ ساٹھ ہزار پنشنرز کی پنشن میں 5 سے 40 فیصد تک کٹوتی کی گئی ہے۔ ان میں اکثریت کی زندگی کا کلی طور پر دارومدار ان پہلے سے قلیل پنشنوں پر ہے۔ علاوہ ازیں سرکاری اور نجی شعبے کے محنت کشوں کی تنخواہوں پر بھی ٹیکس لگا کر ان میں کٹوتی کی گئی ہے۔ یہ گزشتہ چھ سالوں سے جاری وحشیانہ کٹوتیوں کی صرف ایک جھلک ہے۔ وسیع پیمانے کی نجکاری اس کے علاوہ ہے جس میں حکومتی اثاثے کوڑیوں کے بھاؤ سرمایہ داروں کو بیچے جا رہے ہیں۔ وسیع بیروزگاری کے پیش نظر نوجوانوں کی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں دوسرے ممالک نقل مکانی پر مجبور ہے۔ ایک لاکھ نوجوان ہر سال ہجرت کر رہے ہیں اور 2008ء کے بعد سے ساڑھے چار لاکھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند نوجوان ملک چھوڑ چکے ہیں۔

یونان کا بحران یورپی یونین کی تشکیل کی کھوکھلی اور مصنوعی بنیادوں کو بھی عیاں کرتا ہے۔ مختلف کیفیات کی حامل اور مختلف (بعض اوقات مخالف) سمتوں میں سفر کرتی ہوئی معیشتوں کو ایک کرنسی میں یکجا کرنا ناممکن ہے۔ یورو کی بندش نے یورپی یونین کے بحران کو زیادہ بگاڑ دیا ہے۔ ماضی میں یورپ کے ممالک بوقت ضرورت اپنی کرنسی کی قدر اور پیسے کی رسد (Money Supply) وغیرہ میں تبدیلی کر سکتے تھے۔ مثلاً گرتی ہوئی برآمدات کو سہارا دینے کے لئے کرنسی کی قدر میں کمی (Devaluation) کا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ اسی طرح معاشی سست روی یا

گراوٹ کے ادوار میں شرح سود کم کر کے یا نوٹ چھاپ کے پیسے کی رسد بڑھا دی جاتی ہے۔ لیکن یوروزون میں کوئی ملک اپنے تئیں ایسی کوئی پالیسی اپنانے سے قاصر ہے۔ جرمنی اور کسی حد تک فرانس جیسی بڑی طاقتیں ہی اپنے مفادات کے تحت مانیٹری پالیسی کا تعین کرتی ہیں جو یونان جیسی چھوٹی اور کمزور معیشتوں کے تقاضوں کے برعکس ہوتی ہے۔اسی طرح یورپ کی مشترکہ منڈی کا فائدہ بھی جرمنی جیسی تکنیکی اور مالیاتی طور پر نسبتاً ترقی یافتہ اور مستحکم سرمایہ دارانہ معیشتوں کو ہوتا ہے جن کا مقابلہ یونان، پرتگال اور سپین جیسی مقابلتاً پسماندہ معیشتیں کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ سب بحران کو بڑی سے چھوٹی معیشتوں میں منتقل کرنے کے مترادف ہے۔لیکن کچھ بورژوا معیشت دانوں اور دائیں بازو کے قوم پرست رجحانات کے برعکس یونان کی یوروزون یا یورپی یونین سے سرمایہ دارانہ بنیادوں پر علیحدگی بھی کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔اس سے کوئی بنیادی تضاد حل نہیں ہوگا بلکہ صرف بحران کی شکل بدلے گی اور یہ زیادہ گہرا ہی ہوگا۔مثلاً موجودہ کیفیت میں یوروزون سے اخراج اور دراشما (یونان کی پرانی کرنسی) کی طرف واپسی صورت میں دراشما کی قدر تیزی سے گرے گی، افراط زر بے قابو ہوگا جس سے عوام کی جمع پونجی اور قوت خرید راتوں رات ہوا میں اڑ جائے گی۔عدم استحکام اور غیر یقینی صورتحال میں سرمایہ تیزی سے ملک سے پرواز کرے گا، سرمایہ کاری ختم ہو جائے گی جس سے معیشت ایک اندازے کے مطابق مزید دو تہائی سکڑاؤ (Contraction) سے دوچار ہو جائے گی۔

سرمایہ داری کے تحت یونان کے المناک بحران کا کوئی حل نہ تو نیولبرل اصلاحات اور نہ کینشین طریقہ کار کے تحت موجود ہے۔ یونان کے محنت کش اور نوجوان گزشتہ چھ سال کے دوران بار بار تحریک میں اترے ہیں اور اس نظام کو چیلنج کیا ہے۔اب تک 32 عام ہڑتالیں ہو چکی ہیں۔ آخری عام ہڑتال ٹیکسوں میں اضافے اور پنشن میں کٹوتیوں کے خلاف 6 مئی 2016ء کو ہوئی ہے۔اس سے قبل 5 جولائی 2015ء کے ریفرنڈم میں 61 فیصد عوام نے کٹوتیوں کے خلاف ووٹ ڈال کر ٹرائیکا (یورپی مرکزی بینک، آئی ایم ایف، یورپی کمیشن) کی شرائط کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ ریفرنڈم سے قبل جون کے اواخر اور جولائی کے آغاز میں دارالحکومت ایتھنز میں لاکھوں افراد نے کٹوتیوں کے خلاف مظاہروں میں حصہ لیا تھا۔ یہ ایک انقلابی تحریک تھی جسے مارکسی قیادت اور

انقلابی سوشلزم کے نظریات میسر آتے تو سرمایہ داری کو اکھاڑا جا سکتا تھا اور یورپ کا منظر نامہ بدل سکتا تھا۔ لیکن سائریزا کی قیادت نے کھلی غداری کرتے ہوئے یورپی آقاؤں اور سامراجی مالیاتی اداروں کی اطاعت کا راستہ اپنایا۔ سائریزا کا ابھار ہی آسٹیریٹی مخالف لفاظی اور نعرے بازی کی بنیاد پر ہوا تھا۔ اقتدار میں آ کر یہی پارٹی آج بدترین کٹوتیاں لاگو کر رہی ہے جس سے اصلاح پسندی کی حدود کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ سوشل ڈیموکریسی اور بائیں بازو کی اصلاح پسندی تاریخی طور پر متروک ہو چکی ہے اور آج کے عہد میں بحران کا بوجھ محنت کش عوام پر منتقل کئے بغیر سرمایہ داری کو چلانے کا کوئی دوسرا راستہ اصلاح پسندوں کے پاس نہیں ہے۔

یونان میں تحریک قیادت کی غداری سے گھائل ہو کر مجروح ضرور ہوئی ہے، مری نہیں ہے۔ اس وقت سائریزا کی حکومت یورپ کی غیر مقبول ترین حکومتیں میں سے ایک ہے۔ عوام پر تمام تر معاشی حملوں کے باوجود ریاستی قرضوں میں کمی اور بحران سے نکلنے کے امکانات مخدوش ہیں۔ خود آئی ایم ایف کے مطابق یونان کے قرضے کا بڑا حصہ اگر معاف نہیں کیا جاتا تو معیشت میں بہتری نہیں آ سکتی۔ یوں آنے والے دنوں میں بڑے پیمانے کی معاشی بحالی کم و بیش خارج از امکان ہے۔ اس غداری سے نفسیاتی اور سیاسی طور پر سنبھلنے کے بعد آنے والے دنوں میں ناگزیر طور پر یونان کا محنت کش طبقہ اور نوجوان نئی تحریکوں میں اتریں گے۔ سائریزا کے استرداد اور ممکنہ ٹوٹ پھوٹ کے پیش نظر تمام تر فرقہ وارانہ روش کے باوجود کمیونسٹ پارٹی (KKE) کی مقبولیت آنے والے دنوں میں بڑھ سکتی ہے۔ اسی طرح سائریزا سے الگ ہونے والی بائیں بازو کی 'پاپولر یونٹی' ایک ٹھوس انداز میں آسٹیریٹی اور سرمایہ داری مخالف پروگرام دیتی ہے تو مقبولیت حاصل کر سکتی ہے۔ سماج کی پسماندہ پرتوں میں 'گولڈن ڈان' جیسی انتہائی دائیں بازو کے رجحانات کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے لیکن آج کے عہد میں طبقاتی قوتوں کے توازن کے پیش نظر فسطائیت کا غلبہ خارج از امکان ہے۔ اسی طرح درمیانے راستے والی کسی سرمایہ دارانہ پارٹی کی بڑی مقبولیت کے امکانات کم ہیں۔ بحران کے شدت اختیار کرنے پر نیم آمرانہ طرز کی 'ٹیکنو کریٹ' حکومت کے امکانات کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسی حکومت کوئی بھی مسئلہ حل کرنے سے قاصر ہو گی اور تحریک کو مزید مشتعل کر سکتی ہے۔ یونان کا تناظر آخری تجزیئے میں یورپ کے

دوسرے ممالک میں سیاسی وسماجی تبدیلیوں سے مشروط ہے۔ یورپ میں وہ معاشی بنیاد ٹوٹ چکی ہے جس پر کئی دہائیوں سے روایتی سیاست براجمان تھی۔ روایتی سیاست کی ٹوٹ پھوٹ سے نئے رجحانات جنم لے رہے ہیں اور یہ سلسلے آنے والے عرصے میں جاری رہے گا۔ کسی ایک ملک میں انقلابی تحریک پورے خطے اور دنیا بھر میں اثرات مرتب کرے گی۔ دنیا بھر کی طرح یونان کے محنت کش اور نوجوان سرمائے کے جس شکنجے میں جکڑے ہیں اسے قرضوں کی غیر مشروط اور مکمل ضبطگی اور مالیاتی، پیداواری اور خدمات کے شعبہ جات کی محنت کشوں کے جمہوری کنٹرول میں نیشنلائزیشن کے ذریعے ہی توڑا جا سکتا ہے جو سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے سرمایہ داری کے خلاف بے رحم بغاوت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

سپین

2008ء میں شروع ہونے والے مالیاتی واقتصادی بحران کے بدترین اثرات یورپ پر پڑے، سپین جو کہ یورپی یونین میں پانچویں بڑی معیشت ہے اس وقت سخت معاشی بحران کا شکار ہے۔ اس بحران کے اثرات سپین کے لئے بدترین ثابت ہوئے جس میں تمام عرصے کی خوشحالی کا فریب عیاں ہوا۔ معاشی بحران کی وجہ سے کئی کمپنیاں دیوالیہ ہوئیں جس سے بلند پیمانے پر بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔ اس کیفیت میں یورپی یونین اور عالمی مالیاتی اداروں کے ایما پر PSOE کے بعد PP کی حکومت نے سخت کٹوتیوں کے پروگرام پر عمل درآمد کرنا شروع کر دیا۔ ان اقدامات کی وجہ سے سماج پر گہرے منفی اثرات پڑے، غیر سرکاری تنظیم اوکسفیم کی رپورٹ کے مطابق OECD ممالک میں بحران زدہ یونان اور میکسیکو جیسے ممالک سے بھی زیادہ سماجی تفریق سپین میں پائی جا رہی ہے۔ معاشی بحران کے آغاز کے بعد 23 لاکھ افراد غربت کا شکار ہو چکے ہیں۔ حکومتی پالیسیوں کے باعث محض سات سالوں میں عام محنت کش کی تنخواہ میں 22 فیصد کمی واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے نجی کمپنی کا ایک اوسط سی ای او (CEO) ایک عام محنت کش سے 158 گنا زیادہ کما رہا ہے۔ ملک سے 'ٹیکس ہیونز' میں سرمائے کی منتقلی کی شرح 2000 فیصد ہو چکی ہے۔ ریاستی قرضہ جی ڈی پی کے 100 فیصد کو چھو رہا ہے۔ حکومتی دعووں کے برعکس بیروزگاروں

کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بکھرتی سرمایہ داری نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک پوری نسل پیدا کی ہے جنہیں کبھی روزگار ملا ہی نہیں اور نہ ہی ملنے کی امید ہے۔ ملک میں لیبر اصلاحات کے بعد مستقل روزگار کی بجائے عارضی ملازمتوں کی شرح زیادہ ہے۔ سرمایہ داروں کو سستی محنت کی فراوانی ہے جس کی وجہ سے اوسط اجرت تیزی سے کم ہو رہی ہے، مثال کے طور پر اس وقت کل لیبر فورس کے محض 8 فیصد محنت کش ہی مستقل ملازم ہیں اور ان میں بھی ہر تیسری ملازمت پارٹ ٹائم ہے یعنی دن میں چند گھنٹے یا ہفتوں میں چند دن ہی کام دستیاب ہے۔ عارضی ملازمتوں کا اوسط دورانیہ 50 دنوں تک رہ چکا ہے۔ قومی ادارہ برائے شماریات کی تازہ رپورٹ کے مطابق نئے عارضی ملازمت کے معاہدوں میں تنخواہ کی شرح اوسط تنخواہ سے 39 فیصد کم ہے۔ اس بحران کی حقیقت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ 'کریڈٹ سوئس' کی رپورٹ کے مطابق 20 فیصد امیر ترین افراد سپین کی 68.8 فیصد دولت پر قابض ہیں جبکہ باقی 80 فیصد آبادی کے پاس صرف 31.2 فیصد حصہ ہے۔ سپین کے زیادہ تر نوجوان روزگار کی تلاش میں سپین کی سابق نوآبادیات اور دوسرے یورپی ممالک کا رخ کر رہے ہیں۔

2011ء میں علاقائی انتخابات کے دوران کٹوتیوں کے خلاف شاندار'' خفگی والوں کی''(Indignados)تحریک شروع ہوئی جس میں ملک بھر میں کٹوتیوں کے خلاف مظاہرے منعقد ہوئے جس میں لاکھوں افراد نے شرکت کی۔ اس تحریک کا آغاز رجوائے حکومت کی ٹیکس اصلاحات، تنخواہوں میں کمی اور کرپشن کے خلاف مطالبات پر ہوا لیکن اس میں پورے سرمایہ دارانہ نظام اور سیاسی افق پر موجود دو پارٹی سسٹم کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا گیا 2012ء میں کان کنوں کی شاندار جدوجہد نے سماج میں ایک نئی ہلچل پیدا کی اور عوام کی وسیع تر پرتوں نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔ یہ شاید 1970ء کی دہائی کے بعد پہلی بار ہو رہا تھا۔ ان تحریکوں نے ایک طرف تو مروجہ نظام کو مکمل طور پر رد کیا تو دوسری طرف نئے سیاسی مظاہر وجود میں آئے جیسا کہ پوڈیموس۔

دسمبر 2015ء کے عام انتخابات کے بعد پیدا ہونے والی ہنگ پارلیمنٹ کے نتیجے میں کوئی بھی پارٹی حکومت بنانے میں ناکام رہی اسی لئے چھ ماہ بعد سپین میں دوبارہ انتخابات 27

جون کو منعقد ہوئے۔ ان انتخابات کے نتائج نے سیاسی تعطل کم و بیش قائم رکھا ہے، سپین کے قانون کے مطابق 350 اراکین کی پارلیمنٹ میں حکومت سازی کے لئے سادہ اکثریت یعنی 176 ارکان کی ضرورت تھی۔ اس بار پھر کوئی پارٹی بھی سادہ اکثریت لینے میں ناکام ہوئی۔ اگست تک کوئی بھی پارٹی حکومت بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ نتائج کے مطابق دائیں بازو کی حکمران جماعت پیپلز پارٹی 33.03 فیصد ووٹوں سے 137 نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی جبکہ سوشل ڈیموکریٹ PSOE، پچاسی نشستیں (22.67 فیصد ووٹ) حاصل کر کے ملک کی دوسری بڑی پارٹی کے طور پر اپنی ساکھ بچانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ 9 مئی کو یونائیٹڈ لیفٹ (جس کا اہم حصہ کمیونسٹ پارٹی ہے) اور پوڈیموس کے مابین بننے والا انتخابی اتحاد 'یونیڈوس پوڈیموس' (لفظی معنی ''متحد ہو کر ہم کر سکتے ہیں'') ایک اہم پیش رفت تھی لیکن تمام تر تجزیوں کے برخلاف یہ اتحاد 21.11 فیصد ووٹ (71 سیٹیں) ہی حال کر سکا۔ اگر دسمبر کے انتخابات سے موازنہ کیا جائے تو اس بائیں بازو کے اتحاد کی مجموعی نشستوں میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوئی۔ تاہم ریاستی CIS ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی رپورٹ کے مطابق یونائیٹڈ لیفٹ کے 30 سالہ لیڈر 'البرٹو گیرزون' ملک میں قائم مقام وزیر اعظم 'ماریانو روجائے' اور پوڈیموس کے لیڈر 'پابلو ایگلسیاس' سے بھی زیادہ پسندیدہ رہنما بن چکے ہیں۔

تھوڑے عرصے پہلے بننے والی بائیں بازو کی جماعت پوڈیموس دسمبر 2015ء میں 20.66 فیصد ووٹوں کے ساتھ 69 سیٹیں لینے میں کامیاب ہوئی تھی۔ فرانکو کی آمریت کے خاتمے کے بعد سے سپین کا سیاسی افق دو پارٹیوں، دائیں بازو کی پیپلز پارٹی (PP) اور سپین سوشلسٹ ورکرز پارٹی (PSOE) میں تقسیم تھا۔ PSOE سپین کی قدیم ترین پارٹیوں میں شمار ہوتی ہے جس کی بنیاد میڈرڈ میں 2 مئی 1879ء کو ہسپانوی محنت کشوں نے رکھی۔ اس طرح پیپلز پارٹی (PP) کی بنیادیں فرانکو آمریت کے سابق وزیر مینائل فراگا کے 1976ء میں قائم ہونے والے پیپلز الائنس میں ملتی ہیں۔ 1977ء سے یکے بعد دیگرے ان دونوں پارٹیوں کی حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہیں۔ لیکن اب محنت کشوں کی مضبوط ترین روایت PSOE نظریاتی دیوالیہ پن اور دائیں بازو کی اصلاح پسند پالیسیوں کے باعث اپنی عوامی حمایت کھو رہی ہے۔

2012ء سے 2015ء تک پارٹی کا ووٹ بنک 28.7 فیصد سے کم ہوتا ہوا 22.01 فیصد رہ گیا ہے، حکمران جماعت PP کے خلاف ایک نام نہاد حزب اختلاف کا کردار ادا کرنے کے بعد اس کی حمایت میں مزید کمی کے امکانات ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق PSOE کے 40 سال سے زائد عمر کے ووٹرز قدامت پرست جماعتوں کی طرف راغب ہو رہے ہیں جبکہ زیادہ تر نوجوان ووٹرز بائیں بازو کی نئی جماعتوں مثلاً پوڈیموس کی حمایت کر رہے ہیں۔ پچھلے سال مئی میں ہونے والے علاقائی انتخابات میں کئی اہم شہروں اور علاقوں میں PSOE اور PP کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان انتخابات میں بھی اہم کامیابیاں پوڈیموس اور دیگر بائیں بازو کی جماعتوں نے حاصل کیں، پوڈیموس کے حمایت یافتہ کونسلروں نے کہا کہ انہوں نے یہ حلف صرف سرکاری جمع خرچ کے لیے لیا ہے اور ان کا وعدہ ہے کہ وہ بادشاہ کے نہیں بلکہ محنت کش طبقے کے وفادار رہیں گے۔ اسی طرح البرٹو گیرزون نے اخباری نمائندگان سے بات کرتے ہوئے کہا کہ 'اس ملک میں کچھ ہو رہا ہے جو میری طرح کا کمیونسٹ جو ملک کو جمہوریہ بنانا چاہتا ہے عوامی رائے عامہ کے مطابق سب سے قابل قدر سیاست دان بن چکا ہے'۔ البرٹو گیرزون درحقیقت پوڈیموس کے لیڈر ایگلیسیاس سے بھی زیادہ ریڈیکل پروگرام دے رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کٹوتیوں کی پالیسیاں جاری رہی تو یورپی یونین بھی ختم ہو سکتی ہیں۔ ان دونوں پارٹیوں کے دسمبر کے انتخابی پروگرام کے مطابق اصلاحات کا نفاذ، کٹوتیوں کی پالیسیوں کا خاتمہ، حکمران جماعت کے عوام دشمن قوانین کا خاتمہ، بجٹ خسارے میں کمی اور ریاستی سرمایہ کاری میں اضافہ شامل ہیں۔ یہ یقیناً کوئی انقلابی سوشلسٹ منشور تو نہیں ہے لیکن روایتی بائیں بازو کے برعکس خاصا 'ریڈیکل' ضرور ہے۔ PSOE نے اپنے سابقہ 8 سالہ دور حکومت میں بھی کٹوتیوں کی 'نرم' پالیسیوں پر عمل درآمد کیا جس کی وجہ سے آبادی کا اہم حصہ سوچنے اور سیاسی رائے بدلنے پر مجبور ہوا ہے۔

حالیہ تحریکوں میں جہاں مقداری حوالوں سے عوام بالخصوص محنت کشوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی وہیں پر معیاری حوالوں سے ان کے شعور میں تیز تر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں شعوری طور محنت کشوں نے اہم نتائج اخذ کئے ہیں جن کے تحت مروجہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد کو چیلنج کرتے ہوئے متبادل کو تراشنے کی جستجو تیز ہوئی ہے۔ پوڈیموس (اور اب

یونائیٹڈ لیفٹ کے ساتھ اس کا اتحاد) تھوڑے عرصے میں عوامی امنگوں کا مرکز بنے ہیں۔ برسوں سے قائم روایتی پارٹی کی حمایت تیزی سے کم ہوئی ہے اور نئی بننے والی پارٹیاں تیزی سے مقبول ہوئی ہیں۔ لیکن ماضی میں PSOE کے روایتی پارٹی بننے کی ٹھوس مادی بنیادیں موجود تھیں کیونکہ اس وقت سرمایہ داری میں اصلاحات کی گنجائش موجود تھی۔ لیکن نئی ابھرنے والی بائیں بازو کی پارٹیوں کے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے اور کوئی واضح اور ٹھوس انقلابی متبادل فراہم نہ کرنے کی صورت میں وہ تیزی سے مسترد ہو سکتی ہیں۔ ایک بات اور بھی قابل توجہ ہے کہ پوڈیموس کے ابھار کے باوجود PSOE یکسر مسترد نہیں ہوئی ہے اور اس وقت بھی دوسری بڑی پارٹی ہے جبکہ پوڈیموس تیسرے نمبر پر ہے۔ آنیوالے وقت میں PSOE کے اندر ریڈیکلائزیشن کے امکانات کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

PSOE کی حمایت اس وقت پچھلے 40 سال میں سب سے کم ترین سطح پر ہے۔ اسی طرح کچھ عرصے قبل بننے والی دائیں بازو کی 'شہری پارٹی' (Citizen Party) نے 32 نشستیں حاصل کی ہیں۔ عالمی اداروں کی طرف سے سیاسی اشرافیہ پر حکومت بنانے کا دباؤ ڈالا جا رہا ہے، شہری پارٹی اور PP کے اتحاد کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ PP کے PSOE کے ساتھ مل کر حکومت بننے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔

سپین میں اگر دائیں بازو کی مخلوط حکومت بنتی ہے تو وہ انتہائی کمزور ہوگی جسے اقتدار میں آتے ہی محنت کشوں اور عوام پر شدید معاشی حملے کرنا ہوں گے۔ پورے یورپ میں ایک نئے معاشی بحران کے امکانات موجود ہیں۔ ایسے میں طبقاتی جدوجہد میں سپین اور دوسرے یورپی ممالک میں بھی تیزی آئے گی اور بائیں بازو کے ریڈیکل پروگرام زیادہ مقبولیت اختیار کریں گے بشرطیکہ انہیں ٹھوس انداز میں صبر آزما طریقے سے پیش کیا جائے۔ بہرحال سرمایہ داری کا خاتمہ، جو اس نظام کے بحران در بحران کو منطقی انجام تک پہنچا سکتا ہے، مارکسی قیادت کے بغیر ناممکن ہے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی سیاسی ہلچل بڑھ رہی ہے اور مروجہ سیاست تنزلی کا شکار ہے۔ بیلجئیم میں ریلوے اور ٹرانسپورٹ سے لے کر پوسٹل سروس اور دوسرے کئی شعبوں میں ہڑتالوں کا سلسلہ جاری ہے۔ کوئی ایسا ملک اب یورپ میں نہیں ہے جہاں معاشی، سماجی اور سیاسی

استحکام موجود ہو۔لیکن جہاں پولرائزیشن دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے اتار چڑھاؤ کی صورت میں سامنے آئی ہے وہاں سکوت اور ٹھہراؤ کے مرحلے بھی چند ماہ کے لیے طاری ہو جاتے ہیں۔2008ء میں شروع ہونے والا بحران جب یورپ میں داخل ہوا تو اس کے اثرات کا سیاسی اظہار سب سے ریڈیکل انداز میں یونان میں سائریزا کے ابھار کی شکل میں سامنے آیا۔سائریزا حکومت کی غداری نے تحریک کو مجروح کیا ہے لیکن یونان کا بحران ختم ہونے کی بجائے بڑھ ہی رہا ہے۔کارپوریٹ میڈیا کی جانب سے کوریج نہ ملنے کے باوجود وہاں تحریک وقتی پسپائی کی کیفیت میں بھی اپنا اظہار وقتاً فوقتاً کر رہی ہے اور ایک بار پھر بڑے پیمانے پر پھٹ بھی سکتی ہے۔اس طرح پرتگال میں بائیں بازو کا ابھار اصلاح پسندی نے گراوٹ میں تبدیل کر دیا لیکن یہ تحریکوں کا سلسلہ مارکسی قیادت کے فقدان کی وجہ سے طوالت اختیار کر سکتا ہے۔کیونکہ اب سرمایہ دارانہ نظام کا بحران اتنا گہرا اور طویل ہو چکا ہے کہ اس پر بائیں بازو کی اصلاح پسندی کی سیاست بھی ممکن نہیں رہی۔

یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ عالمی جنگ کے بعد یورپ میں نسبتاً سماجی و سیاسی استحکام کا عہد سرمایہ داری کی حدود میں رہتے ہوئے اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔سماجوں میں دائیں اور بائیں بازو کی جانب تیز ترین سیاسی حرکت ان میں موجود خلفشار اور بحران کا اظہار ہے اور یہ لمبے عرصے تک چل سکتا ہے۔یہ عدم استحکام یورپ کا نیا معمول بن سکتا ہے جیسا کہ گزشتہ صدی میں غیر ترقی یافتہ سابقہ نوآبادیاتی ممالک میں تھا۔یہ طوفانی واقعات قبل از انقلاب اور انقلابی ادوار کا پیش خیمہ ہیں۔لیکن اس طویل عمل میں ردانقلاب کے ادوار اور محنت کشوں اور نوجوانوں کی جدوجہد میں رکاوٹیں بھی آئیں گی۔

روس

پچھلے چند برسوں سے عالمی معاشی بحران نے جس سفارتی اور عالمی طاقتوں کے توازن میں ہلچل پیدا کی ہے اس میں پیوٹن اور روس کو کارپوریٹ میڈیا زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روس ایک بڑی طاقت ہے، امریکی سامراج داخلی معاشی اور سماجی بحران سے تنزلی کا شکار ہے، یورپ شدید اقتصادی انتشار میں ہے لیکن صورتحال روسی سپر پاور کی بھی اندر سے بہت کھوکھلی ہے۔ جابرانہ ''جمہوریت'' اور داخلی مخالفت کو کچلنے کی پالیسی، خارجی تضادات مثلاً شام، یوکرین اور کریمیا میں فوجی مداخلت اور ایران، ترکی اور مشرقِ وسطیٰ میں امریکی پسپائی سے جنم لینے والے خلا کو پر کرنے کی پالیسیوں کے باوجود بھی پیوٹن کی مقبولیت عارضی اور جذباتی نوعیت کی ہے۔

جوں جوں روس میں داخلی طور پر اقتصادی اور معاشرتی بحران بڑھے گا پیوٹن کی یہ جارحانہ پالیسیاں خارجی اور داخلی طور پر بھی مزید شدت اختیار کریں گی۔ پچھلے دو سال سے روسی معیشت ایک گہری تنزلی کا شکار ہے۔ پچھلے دو سالوں سے جی ڈی پی کی شرح نمو مسلسل منفی میں ہے یعنی معیشت سکڑ رہی ہے اور Recession میں ہے۔ یہ ایک مزید بڑے اقتصادی زوال میں گر سکتی ہے۔ اس میں اہم عناصر تیل کی قیمتوں میں شدید کمی، مغربی ممالک کی اقتصادی پابندیاں اور گرتی ہوئی بیرونی سرمایہ کاری ہے۔ یوکرین اور شام میں فوجی کاروائیوں نے بھی روس کے خزانے کو بری طرح نچوڑا ہے۔ یوکرین میں بحران سے الٹا روس سے مالیاتی سرمائے کی باہر کے ممالک میں اڑان تیز ہوگئی ہے۔ 2014ء میں 160 ارب اور 2015ء میں 180 ارب ڈالر یہاں سے باہر منتقل کیے گئے۔ بجٹ کا خسارہ 95 ارب ڈالر سے تجاوز کر گیا ہے اور روسی کرنسی روبل کی قیمت آج 2014ء کی نسبت 90 فیصد کر گئی ہے۔ لیکن ہر سرمایہ دارانہ معاشرے کی طرح روس میں بھی معاشی بحران کی یہ برق غریبوں پر ہی گری ہے۔ افراطِ زر ایک سال میں 7 فیصد سے بڑھ کر 17 فیصد ہو گیا ہے۔ بہت سی غذائی اشیا جو روس یورپ اور امریکہ سے درآمد کیا کرتا ہے پابندیوں کی وجہ سے انکی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً گوشت کی قیمت میں 20 فیصد،

آلو 66 فیصد، پیاز 40 فیصد مہنگا ہوا ہے۔ فروری 2016ء کے آخر سے روس کی سپر مارکیٹوں میں 20 اہم ضروریات کی اشیا کی قلت پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن ان غذائی اور دوسری اہم استعمال کی اشیا کی مہنگائی اور قلت کے علاوہ علاج اور صحت کی سہولیات کی عوام کو فراہمی میں بھی بڑے پیمانے پر کٹوتیاں کی گئی ہیں۔ دارالحکومت ماسکو میں بھی ہسپتالوں کے ایک چوتھائی 'آؤٹ ڈور' اور 'ان ڈور' یونٹ بند ہو چکے ہیں۔ اس سے باقی علاقوں کی صورتحال کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی صورتحال تعلیم کے شعبے میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی معاشی اور صنعتی زوال کے ساتھ برطرفیوں اور بیروزگاری میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ روس کی وزارتِ لیبر کے مطابق 2014ء میں 1,58,000 ملازمتیں ختم کی گئیں جبکہ 2015ء کے صرف پہلے دو ماہ میں 1,27,000 ملازمتوں کو ختم کیا گیا۔ صنعتی شعبے میں ان کٹوتیوں کے علاوہ تعلیم اور دوسرے شعبوں میں اساتذہ اور دوسرے تکنیکی اور سرکاری ملازمین کی برطرفیاں بھی تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ روس کی 83 میں سے 63 علاقائی حکومتیں اس وقت دیوالیے کا شکار ہو رہی ہیں۔ اس وقت ان صوبائی اور مرکزی حکومتوں کا قرضہ 300 ارب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے۔ پیوٹن کے پاس اب جبر کے علاوہ کوئی اور ہتھکنڈا نہیں ہے جس سے وہ اس بحران کے سیاسی اور سماجی مضمرات کو دبانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کی موجودہ مقبولیت کے باوجود جو بغاوت کی پہلی لہریں ابھر رہی ہیں آنے والے دنوں میں وہ طوفانی روپ اختیار کریں گی تو ان کو ریاستی جبر سے کچلنا ممکن نہیں رہے گا۔

1991ء میں جب سوویت یونین کا انہدام ہوا تھا تو مغرب میں ایک بے ہودہ جشن منایا گیا تھا۔ سامراجیوں کا خیال تھا کہ اب ان کی طاقت اور وحشت کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں رہے گا۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی اس وقت یورپی یونین بننے کا آغاز ہو رہا تھا، معیشت میں قدرے ترقی کے رجحانات تھے اور ان بنیادوں پر وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ روس میں ایک تابعدار حاکمیت قائم ہو گی۔ وہ آسانی سے اسکی منڈیوں پر قبضہ کر لیں گے اور انکی منافع خوری اور دولت میں بے پناہ اضافہ ہو گا۔ ابتدا میں بورس یلسٹن جو ردِ انقلاب اور سرمایہ داری کی استواری کے بعد روس کا صدر بنا تھا وہ مغرب کا پیروکار بھی تھا اور ہر وقت نشے میں دھت بھی رہتا تھا۔ لیکن روس میں اس نظام زر کے غروب کے عہد میں سرمایہ داری کی جو شکل ابھری وہ قطعاً کوئی ترقی پسندانہ یا ''جمہوری'' کردار نہیں

رکھتی تھی بلکہ وہ ایک مجرمانہ یا مافیا سرمایہ داری تھی۔ یورپ کو لوٹنے سے پیشتر روس میں ابھرنے والے غنڈہ گرد سیٹھوں نے اپنی تجوریاں بھرنی شروع کر دیں اور یورپ خصوصاً لندن میں اس لوٹ مار سے محلات خریدے اور بدقماشیوں کی انتہا کرنا شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ آخر کار پیوٹن کی شکل میں سامنے آیا جو مافیا سرمایہ داری کا ڈان بن کر ابھرا ہے۔

مغرب کے لیے سوویت یونین کا ٹوٹنا اور روس میں سرمایہ داری کی بحالی وبال جان بن گئی ہے۔ پیوٹن کوئی لینن نہیں ہے بلکہ لینن کا کٹر دشمن ہے۔ پیوٹن اپنے آپ کو 'زار' (قدیم روس کے بادشاہوں کا لقب) سمجھتا ہے۔ اسی لیے اس نے فوجی اور سفارتی جارحیت ایک انداتا کے انداز میں تیز کی ہے۔ لیکن اس سارے کھیل میں مغربی سامراجی اب پیوٹن کی بلا کو اسلامی بنیاد پرستی کی طرح یورپ، امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے عوام کو خوفزدہ کرنے اور عدم تحفظ پیدا کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اپنے داخلی جبر و استحصال کو جاری رکھنے کے لئے یہ مغربی حکمران پیوٹن کو 'بیرونی خطرے' کے طور پر اپنے ممالک میں ابھار رہے ہیں۔

روس کا شمار دنیا کے کرپٹ ترین ممالک میں ہوتا ہے جہاں معیشت میں کالے دھن کی گہری سرائیت ہے۔ روس میں مرکزی حکومت کے ہیڈ کوارٹر کریملن میں 30 ارب ڈالر کی سالانہ کرپشن ہو رہی ہے۔ جبکہ معاشرے میں اوسط عمر میں شدید کمی اور کم سن بچوں کی اموات میں بڑا اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس خستہ صورتحال میں بھی اب عوام میں اس نظام زر کے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبات ابھرنے شروع ہو گئے ہیں۔ روس میں ان کے پاس سوویت یونین کی شکل میں ماضی کی ایک ایسی یاد ہے جہاں کم از کم تعلیم، علاج، ٹرانسپورٹ، بجلی اور دوسری سہولیات عوام کو مفت حاصل تھیں اور روزگار کی ضامن ریاست تھی۔ امریکی جریدے نیوز ویک کے 13 اگست کے شمارے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ''ایک چوتھائی صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود کمیونسٹ نظریات روس میں بہت تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ سماجی بہبود اور فلاحی سوویت یونین کی یادیں اب زیادہ شدت سے لوگوں کو گرما رہی ہیں۔ موجودہ روس میں معاشی کشمکش نے وسیع آبادی کو ہلکان کر دینے والی غربت اور محرومی کی ذلت میں دھکیل دیا ہے۔ اس سے کمیونسٹ پارٹی کی حمایت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے''۔

پیوٹن زیادہ لمبے عرصے تک بیرونی ''شجاعت'' کی داستانوں اور پراپیگنڈے سے عوام کو مائل نہیں کرسکتا۔ انکی توجہ اس بھوک اور ذلت سے ہٹا کر زیادہ عرصہ ان خارجی مہمات پر مبذول نہیں رکھی جاسکتی۔ روس میں ایک بڑی تحریک دیر سے نہیں شاید جلد ابھرے گی۔ اکتوبر انقلاب کی سرزمین گواہ ہے کہ سوشلزم کے تحت چند سالوں میں معاشرہ سماجی، معاشی اور ثقافتی طور پر اتنی ترقی کرسکتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام صدیوں میں نہیں کرسکا اور نہ کرسکتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ (USA)

2008ء کا بحران 1929ء کے بعد کا شدید ترین معاشی زوال ہے۔ اس کے سماجی اثرات گہرے ہیں۔ اگرچہ 2009-2010ء سے سرکاری طور پر معیشت مندی سے نکل آئی تھی لیکن شرح نمو بحران سے پہلے کی سطح پر نہیں جا سکی۔ محنت کشوں اور عوام کو اس کی کڑی قیمت چکانا پڑی اور پڑ رہی ہے۔ حکومت کی جانب سے بڑے بینکوں اور کارپوریٹ کمپنیوں کو 700 ارب ڈالر بیل آؤٹ کی شکل میں براہ راست دیئے گئے جو کہ عوام کے ٹیکس کا پیسہ تھا۔ لیکن بالواسطہ طور دی جانے والی رعایات جن میں ٹیکس بریک (ٹیکس میں چھوٹ) اور دیگر شامل ہیں، ان کی مالیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے حکومت کو بڑے پیمانے پر قرضوں کا سہارا لینا پڑا ہے۔ امریکی حکومت کے قرضے اور جی ڈی پی کا تناسب 2006ء میں 64.8 فیصد تھا جو 2015ء میں 104 فیصد تک جا پہنچا ہے۔ اس کے بعد Quantitative Easing یا مقداری آسانی کے طریقے سے نوٹ چھاپ کر مارکیٹ میں پھینکے گئے تاکہ پیسے کی سپلائی سے منڈی متحرک رہے۔ لیکن یہ نام نہاد بحالی بھی مسائل سے دوچار ہے اور 2016ء کی پہلی سہ ماہی میں شرح نمو حدف 0.7 فیصد کی بجائے 0.5 فیصد رہی۔ محنت کش طبقے کے لیے اس بحالی کے ثمرات صرف اعداد و شمار تک ہی محدود ہیں اور ان کی حقیقی قوت خرید اور معیار زندگی میں بہتری کی بجائے گراوٹ آتی جا رہی ہے۔ امریکی لیبر ڈیپارٹمنٹ کے مطابق گزشتہ برس فی گھنٹہ اجرتوں میں صرف 2.3 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ اکنامک پالیسی انسٹی ٹیوٹ کے مطابق کم آمدنی والی امریکیوں کو معاشی بحالی کے ثمرات سے مستفید ہونے کے لیے اجرتوں میں سالانہ 3 سے 4 فیصد کا اضافہ درکار ہے۔ درحقیقت حقیقی اجرت میں 1968ء سے مسلسل کمی آ رہی ہے۔ موجودہ کم سے کم اجرت 7.25 ڈالر فی گھنٹہ ہے جو 1968ء میں ڈالر کی 2015ء کی قدر کے مطابق 10.86 ڈالر تھی، یعنی اجرت کم ہوئی ہے۔ 1973ء سے 2014ء تک امریکی محنت کشوں کی پیداواریت (Productivity) میں 72.2 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ اس عرصے میں ایک عام محنت کش کی اجرت محض 9.2 فیصد بڑھی۔

دنیا کا سب سے دولت مند ملک ہونے کے ساتھ امریکہ میں دولت کی عدم مساوات بھی سب سے زیادہ ہے۔ امیر ترین 0.1 فیصد کے پاس 90 فیصد آبادی سے زیادہ دولت مجتمع ہے۔ بورژوازی کی اپنی کریڈٹ ریٹنگ ایجنسی سٹینڈرڈ اینڈ پوورز نے 2014ء میں اس دولت اور غربت کی بڑھتی ہوئی خلیج کو طویل مدت میں معاشی ترقی کے لیے ایک خطرہ قرار دیا تھا۔ چار کروڑ ساٹھ لاکھ افراد حکومت کے مقرر کردہ غربت کے معیار سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ شرح نسلی اقلیتوں اور بچوں میں سب سے زیادہ ہے اور ہر پانچ میں سے ایک بچہ غربت کا شکار ہے۔ امریکہ میں بچوں میں غربت کی 20.5 فیصد شرح اضافہ صنعتی ممالک میں تقریباً سب سے زیادہ ہے، مثلاً معاشی بحران سے تباہ حال یونان میں یہی شرح 20.4 فیصد ہے۔ ان بچوں کے غریب ہی رہ جانے کے امکانات اس چکر سے باہر نکلنے کے مقابلے میں 32 گنا زیادہ ہیں۔ بحران سے قبل 2007ء میں 12.2 فیصد امریکی غذائی عدم تحفظ کا شکار تھے، یہ شرح اب 15 فیصد ہے۔

بے روزگاری کی شرح بھی 2008ء کے کریش سے پہلے کی سطح پر نہیں لوٹ سکی۔ فروری میں صدر اوباما نے بڑے فخر سے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ بے روزگاری 4.9 فیصد تک آ گئی ہے، لیکن حقیقت اس سے کہیں تلخ ہے۔ حکومت کے بیورو آف لیبر سٹیٹسکس کے مطابق بے روزگار لیبر فورس کا وہ حصہ ہے جو کام کی تلاش میں ہے۔ اس میں پارٹ ٹائم یا جز وقتی محنت کش اور ایسے افراد شمار نہیں کیے جاتے جو لمبے عرصے سے بے روزگار ہونے کی وجہ سے کام کی تلاش ہی ترک کر چکے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کو شامل کیا جائے تو بے روزگاری کی حقیقی شرح 10.5 فیصد بنتی ہے۔ گیلپ کے مطابق امریکہ میں صرف 44 فیصد روزگار اچھی نوکری (گیلپ کے مطابق ہفتہ وار 30 گھنٹے سے زیادہ اور باقاعدہ اجرت) میں شمار کیے جا سکتے ہیں اور درمیانے طبقے کو بحال کرنے کے لیے ایسی مزید ایک کروڑ نوکریاں درکار ہیں۔ مئی کے مہینے میں صرف 38,000 نئے روزگار پیدا ہوئے ہیں جبکہ وال سٹریٹ 1,62,000 کی توقع کر رہی تھی۔ مارچ اور اپریل کے روزگار کے اعداد و شمار بھی پہلے رپورٹ کی گئی تعداد سے کم نکلے ہیں۔ یہ پانچ سالوں میں سب سے کم اضافہ ہے۔ جون 2016ء میں فیڈرل ریزرو کی جانب سے شرح سود میں اضافے کا منصوبہ بھی اب مشکوک ہو چکا ہے۔ اس خبر سے سٹاک، ڈالر کی قدر اور حکومتی بانڈز

پر شرح منافع میں فوری گراوٹ آئی ہے۔

امریکہ کی معیشت عالمی معیشت کا ایک جز ہے۔ امریکہ کے کل قرضے کا 46 فیصد یعنی 4.5 ٹریلین ڈالر غیر ملکی حکومتوں سے لیا گیا ہے۔ ان میں سب سے بڑا حصہ چین کا ہے جس کے پاس 1.2 ٹریلین ڈالر کے بانڈز اور نوٹس ہیں۔ چین امریکہ کا کینیڈا کے بعد دوسرا بڑا تجارتی پارٹنر ملک ہے۔ رواں سال جنوری میں چینی سٹاک مارکیٹ کے کریش کے نتیجے میں امریکی سٹاک کا ڈاؤ جونز انڈسٹریل انڈیکس ایک ہزار پوائنٹس گر گیا یعنی اس کی قدر چھ فیصد کم ہوگئی۔ چینی معیشت کی مزید متوقع سست روی امریکی سرمایہ کاروں کے لیے باعث تشویش ہے اور ایک کمزور معاشی بحالی ایک بڑے دھچکے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ چین اور امریکہ کی باہمی انحصاری کے ساتھ ساتھ دونوں ممالک کے سرمایہ دار اپنی منڈیوں کو بچانے کے لیے تجارتی اور محصولاتی تنازعات میں بھی سرگرم ہیں۔ اس تجارتی جنگ میں شدت عالمی تجارت کو بری طرح متاثر کر سکتی ہے جس سے دونوں ممالک سمیت عالمی معیشت ایک گہری کساد بازاری میں جا سکتی ہے۔ بورژوازی کے سنجیدہ حصے اس خطرے سے بخوبی آگاہ ہیں لیکن اپنے اپنے تنگ نظر مفادات کے ہاتھوں مجبور بھی ہیں۔

صنعت

امریکی صنعت کئی دہائیوں سے مسلسل زوال کا شکار ہے۔ 1965ء میں امریکی معیشت میں مینوفیکچرنگ (یعنی حقیقی پیداواری صنعت) کا حصہ 53 فیصد تھا جو 1970ء کی دہائی میں 25 فیصد اور 2008ء کے بحران کے بعد سے 12 فیصد کے قریب چل رہا ہے۔ صنعت مسلسل سکڑتی جا رہی ہے اور یہ بحران کے بعد سے صنعتی شعبے کی طویل ترین مندی ہے۔ پیداواری صنعت میں روزگار جس کی اجرت اور مراعات دیگر شعبوں کے مقابلے میں عمومی طور پر بہتر تصور کی جاتی ہیں اس میں بھی مسلسل کمی ہے۔ اس وقت تقریباً 9 فیصد محنت کش صنعتی شعبے سے وابستہ ہیں، 1960ء میں یہ تعداد 31 فیصد تھی۔ Industrial Capacity Utilization یعنی صنعتی پیداواری صلاحیت کا صرف 75 فیصد استعمال ہو رہا ہے، یعنی ایک چوتھائی صنعت سرمایہ داری کے زائد پیداوار کے بحران کی وجہ سے بیکار پڑی ہے۔ یورپی یونین میں پیداواری صلاحیت

کا استعمال 81 فیصد کے قریب ہے۔ بحران زدہ یورپ سے یہ موازنہ امریکی صنعت کی حقیقی صحت کو واضح کرتا ہے۔ 2015ء میں جی ڈی پی میں 2.4 فیصد اضافہ ہوا جبکہ صنعتی پیداوار میں اضافہ صرف 0.3 فیصد تھا۔ انڈسٹریل پروڈکشن انڈیکس 2016ء کی پہلی سہ ماہی میں 104.1 تھا جو بحران سے پہلے 2007ء کی آخری سہ ماہی کے 105.5 سے کم ہے۔ امریکہ میں پیداواری صنعت کے تاریخی زوال میں چین اور دوسرے ممالک میں سستی لیبر کے ہاتھوں زیادہ شرح منافع سے مصنوعات کی تیاری کا اہم کردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں میں امریکی صنعت کا بڑا حصہ چین منتقل ہوا ہے۔ اب کئی صنعتیں اپنے کارخانے تاریخی طور پر شمال اور شمال مشرقی صنعتی ریاستوں سے جنوب کی ریاستوں میں منتقل کر رہی ہیں جو روایتی طور پر زراعت پر منحصر تھیں جس کا مقصد وہاں کے محنت کشوں کی سستی محنت سے مزید منافع کمانا ہے۔ اس کیفیت میں صنعتی شعبے میں نئی سرمایہ کاری کے امکانات بھی مخدوش ہیں۔ تیل کی قیمت میں گراوٹ کے باعث امریکہ میں تیل نکالنے کی صنعت کا بوم بھی ختم ہو چکا ہے اور خام تیل کی پیداوار تقریباً ایک سال سے گرتی چلی آ رہی ہے۔ 2015ء میں تیل نکالنے والی 67 کمپنیاں دیوالیہ ہوئی ہیں جو اس سے پچھلے سال کے مقابلے میں 379 فیصد زیادہ تعداد ہے۔ تیل نکالنے والی رِگز کی تعداد 1999ء کے بعد کم ترین یعنی 489 رہ گئی ہے۔ تیل کی قیمت کے عروج پر 1600 کے قریب رِگز کام کر رہی تھی۔ نتیجتاً اس صنعت کے محنت کشوں کی بڑی تعداد کو فارغ کر دیا گیا اور مزید کو نکالا جائے گا۔ باقی رہ جانے والوں کی اجرتوں اور مراعات میں کمی ہونا ناگزیر ہے۔ گزشتہ جولائی میں فیڈرل ریزرو (ریاستی مرکزی بینک) کی سربراہ نے صارفین کے لیے پیٹرول کی سستی قیمت کی وجہ سے معیشت میں تیزی سے بہتری کی امید کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا جو کہ معیشت کو درپیش مسائل کو ظاہر کر رہا ہے۔ برآمدات میں بھی 2011ء کے بعد کوئی اضافہ نہیں ہوا اور 2014ء سے اس میں مسلسل گراوٹ آ رہی ہے اور اب یہ بحران کے فوراً بعد 2009ء کی سطح تک گر چکی ہیں۔ ڈالر کی مضبوط قدر کے علاوہ اس کی بڑی وجہ عالمی معیشت کی سست روی ہے جو چین اور تیل پیدا کرنے والے کئی ممالک میں آتے ہوئے معاشی مسائل سے مزید سست روی کا شکار ہو گی۔

قرضہ

جہاں امریکہ کا ریاستی قرضہ جی ڈی پی کا 105 فیصد ہے اور امریکہ دنیا کی مقروض ترین ریاستوں میں سے ایک ہے وہیں انفرادی قرضوں کا بوجھ بھی بہت بڑھ چکا ہے۔ رواں سال کی پہلی سہ ماہی میں یہ امریکہ میں 12.25 ٹریلین تھا جو اسی رفتار سے بڑھتے ہوئے سال کے آخر تک 12.68 ٹریلین ڈالر تک جا پہنچے گا، جو کہ 2008ء میں بحران سے پہلے کی سطح ہے۔ اس میں گاڑیوں کی خریداری کے لیے قرضے (آٹو لون) 1.06 ٹریلین ڈالر ہیں۔ آٹو لون کی قسط میں تاخیر بیس سال میں بلند ترین سطح پر ہے اور 6.4 فیصد صارف وقت پر قسط ادا نہیں کر پائے۔ یہ نہ صرف مالیاتی منڈی کے لیے تشویش ناک ہے بلکہ گاڑیوں کی صنعت کے لیے بھی بری خبر ہے۔ اس میں بڑا حصہ تیل کے کریش سے متاثر ریاستوں کا ہے۔ اسی طرح کریڈٹ کارڈ کا قرضہ بھی رواں برس ایک ٹریلین تک جا پہنچے گا۔ 2008ء میں کریش کے وقت یہ 1.02 ٹریلین تھا۔ 2015ء میں 10.6 ملین نئے کریڈٹ کارڈز میں سے 25 فیصد سب پرائم یعنی ایسے صارفین کو جاری کئے گئے جن سے قرضوں کی واپسی کے امکانات زیادہ نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ معیشت میں سست روی کے باعث کاروباری قرضے کم ہیں اور بینک کریڈٹ کارڈز سے ہی منافع کمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ 2008ء کا بحران سب پرائم قرضوں کے بحران کے طور پر ہی شروع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سٹوڈنٹ لون یعنی تعلیمی قرضوں کا حجم کریڈٹ کارڈ کے قرضوں سے تجاوز کر کے 1.23 ٹریلین ڈالر تک جا پہنچا ہے۔ 2015ء میں فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ پر اوسطاً 35 ہزار ڈالر فی کس قرضہ ہے، یہ امریکی تاریخ کی سب سے زیادہ مقروض کلاس ہے۔ بلند شرح بے روزگاری اور خصوصاً اچھی آمدن والی نوکریوں کی قلت کی وجہ سے ان قرضوں کی واپسی مشکل ہوگی اور کئی ریٹائر ہونے کی عمر تک یہ قرضہ چکاتے رہیں گے۔ قرضوں کی مسلسل بلند شرح اور اس میں متواتر اضافے کی بڑی وجہ آمدنی سے زیادہ اخراجات زندگی میں اضافہ ہے۔ 2003ء سے اوسط (Median) گھریلو آمدن میں 26 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ میڈیکل کے اخراجات میں 51 فیصد اور اشیا خورد و نوش کی قیمتیں 37 فیصد بڑھی ہیں۔

ایک طویل عرصے سے تقریباً صفر شرح سود کی افادیت بھی اپنی حدود کو پہنچ چکی ہے۔

Quantitative Easing یا حکومت کی جانب نوٹ چھاپ کر معیشت کو متحرک رکھنے کی پالیسی کے خاتمے کے بعد معیشت میں نمو کی کوئی پائیدار بنیاد موجود نہیں ہے۔ کم شرح سود کے با وجود 2015ء میں پہلی مرتبہ گھر خریدنے والوں کی شرح تین دہائیوں میں کم ترین سطح پر تھی یعنی لوگ مکان خریدنے کے متحمل نہیں ہو پا رہے۔ 2016ء کا آغاز ہی سٹاک کے کریش سے ہوا۔ اگرچہ اس کے بعد منڈی میں بحالی آئی ہے لیکن سٹاک مارکیٹ خطرناک حد تک حقیقی معیشت کی کمزوری سے لاتعلق ہے۔ سٹاک مارکیٹ کی مالیت اور جی ڈی پی کا تناسب 110 فیصد تک جا پہنچا ہے۔ طویل مدت میں یہ اوسطاً 75 کے قریب ہوتا ہے۔ بینکوں کے اثاثوں کی بڑی تعداد حکومتی بانڈز اور صارفین کے قرضوں کی شکل میں ہے جن کی واپسی میں مسائل نظر آنا شروع ہو چکے ہیں۔ حکومت کے قرضے اس کی آمدن سے 600 فیصد زیادہ ہیں۔ حکومتی اور نجی قرضوں کے اس بے پناہ پہاڑ کے بوجھ، مالیاتی محرکات کے خاتمے، عالمی معیشت کی سست روی اور چین میں بڑھتے ہوئے معاشی مسائل کی بنا پر ایک نئے بحران کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اس مرتبہ مرکزی بینک نہ تو شرح سود میں کمی کر کے (جو پہلے ہی 0.25 فیصد ہے) اور نہ ہی حکومت مزید قرضے لے کر معیشت کو سہارا دے سکتی ہے، اور یہ بحران 2007ء کے کریش سے کہیں بدتر ہو سکتا ہے۔ پورٹو ریکو جو امریکہ کا ایک سمندر پار علاقہ ہے پہلے ہی دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ اس کی معیشت کا حجم ملک میں قابل ذکر حیثیت نہیں رکھتا لیکن یہ دیگر ریاستوں اور وفاقی حکومت کے لیے ایک تنبیہہ ہے۔

یہ مالیاتی اور معاشی بحران سماج و صنعت کے بنیادی ڈھانچے کی ٹوٹ پھوٹ اور خستہ حالی کا باعث بنا ہے۔ ملک کا انفراسٹرکچر مسلسل شکست و ریخت کا شکار ہے۔ امریکن سوسائٹی فار سول انجینئرز کے مطابق آنے والے دس برسوں میں انفراسٹرکچر میں اخراجات اور ضرورت کے درمیان 1.44 ٹریلین ڈالر کا فرق ہوگا۔ بندرگاہوں، شاہراہوں، سڑکوں، ریل، پلوں، پانی اور بجلی کی فراہمی کے ڈھانچے کے لیے 2020ء تک 3.32 ٹریلین ڈالر درکار ہیں جبکہ اسکے لیے محض 1.88 ٹریلین ڈالر مختص ہیں اور یہ فرق 2040ء تک 5.18 ٹریلین ڈالر تک پہنچ جائے گا۔ کمزور اور ناکافی انفراسٹرکچر کی وجہ سے 2016ء سے 2025ء کے دوران ہر خاندان کو سالانہ 3400 ڈالر کا نقصان ہوگا۔ انفراسٹرکچر کی وجہ سے ہونے والا نقصان اس کو ٹھیک کرنے کے اخراجات سے زیادہ ہے۔

سامراجی کردار

سرمایہ دارانہ معیشت اور ریاست کی کمزوری کا اظہار خارجی طور پر بھی نظر آ رہا ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد بظاہر ناقابل تسخیر امریکی سامراج ایک مسلسل زوال سے دوچار ہے۔ عراق اور افغانستان میں شکست نے عسکری طاقت کی حدود کو ظاہر کیا ہے۔ روس اور چین کے جانب سے کئی جگہوں پر امریکی طاقت کو کھلے عام چیلنج کیا جا رہا ہے۔ یوکرین کے مسئلے پر روس کی یک طرفہ کاروائی امریکہ اور اس کی کٹھ پتلی یوکرینی حکومت کے لیے ہزیمت کا باعث بنی۔ ساؤتھ چائنا سمندر میں چین امریکہ کو مسلسل اشتعال دلا رہا ہے اور اپنی بحری طاقت میں توسیع کر رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور خصوصاً شام اور عراق میں ایران کی سفارتی اور فوجی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس سے تعلقات بحال کرنے کا کڑوا گھونٹ پینا پڑا ہے۔ کیوبا سے تعلقات کی بحالی بھی کئی دہائیوں سے جاری معاشی ناکہ بندی اور جبر کی پالیسی کی ناکامی کا کھلا اعتراف ہے۔ امریکہ نے 500 ملین ڈالر سے شام میں ہزاروں جنگجوؤں کو تربیت دی تھی لیکن گزشتہ برس امریکی جنرل لائیڈ آسٹن کے مطابق ان میں صرف ''چار سے پانچ'' جنگجو میدان میں موجود تھے۔ سعودی عرب اور اسرائیل جیسے روایتی اتحادی اب امریکی سامراج کو کسی حد تک آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ تاریخ کی سب سے بڑی فوجی قوت ہونے کے باوجود امریکی سماج اور حکمران طبقے میں نئی جنگوں کے لیے حمایت نہیں ہے۔ لیکن اسلحہ ساز اور دوسری جنگی صنعت کا مسلسل دباؤ بھی برقرار ہے۔ امریکہ کا دفاعی بجٹ اس کے بعد کے سات ممالک کے دفاعی بجٹ کے کل جمع سے زیادہ ہے۔ اس کا بڑا حصہ فوجی صنعت کے مختلف حصوں کو منافع بخش ٹھیکوں کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ جدید ترین لڑاکا طیارے F-35 پر 1.5 ٹریلین ڈالر اخراجات آ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود سینٹ آرمڈ سروسز کمیٹی کے چیئرمین جان مکین نے فوجی تاریخ کے سب سے مہنگے پراجیکٹ کو ایک ''سکینڈل'' اور اخراجات میں تجاوز کو ''شرمناک'' قرار دیا ہے۔

لیکن جہاں امریکی سامراج کا خارجی میدان میں ایک جارحانہ کردار ہے وہاں داخلی طور پر یہ بحران زدہ ریاست مزید سفاک کردار کی حامل ہو کر امریکی محنت کشوں پر اقتصادی اور ریاستی مظالم میں اضافہ کرتی جا رہی ہے۔ امریکی معاشرہ صحت کے شعبے میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ

اخراجات کرتا ہے۔ سالانہ فی کس نو ہزار ڈالر خرچ کرنے کے باوجود سرکاری شعبے میں میڈیکل کا کوئی جامع نظام نہیں ہے۔ امریکہ میں جی ڈی پی کا تقریباً 18 فیصد صحت پر خرچ ہوتا ہے جبکہ برطانیہ جہاں نیشنل ہیلتھ سروس (NHS) سب کے لیے مفت ہے وہاں جی ڈی پی کا تقریباً 9 فیصد صحت پر خرچ ہوتا ہے۔ اوسط عمر صنعتی ممالک میں سب سے کم ہے۔ نومولود بچوں میں اموات کی شرح ایک ہزار میں سے 6.1 ہے جو صنعتی ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔ مثلاً جاپان اور فن لینڈ میں یہ شرح 2.3 ہے۔ امریکی محنت کش صحت کی سہولیات کے لیے ہیلتھ انشورنس پر انحصار کرتے ہیں۔ اوباما حکومت کی جانب سے کچھ اصلاحات کے باوجود تین کروڑ تیس لاکھ افراد انشورنس سے محروم ہیں۔ ایک تہائی سے زیادہ امریکی میڈیکل بلوں کی وجہ سے مالی مشکلات کو شکار ہیں۔ 2014ء میں 36 فیصد امریکیوں نے اخراجات کی وجہ سے اپنا علاج کروانے سے گریز کیا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی تحقیق کے مطابق امریکہ میں دیوالیہ ہونے والے افراد میں 62 فیصد میڈیکل بلوں کی وجہ سے دیوالیہ ہوتے ہیں اور ان میں سے 72 فیصد انشورنس ہونے کے باوجود میڈیکل بل ادا نہیں کر سکتے۔

اوسطاً ایک فل ٹائم امریکی محنت کش کو ایک کمرے کے اپارٹمنٹ کا کرایہ بھرنے کے لیے 15.50 ڈالر فی گھنٹہ اور دو کمروں کے لیے 19.35 ڈالر فی گھنٹہ کمانے کی ضرورت ہے جبکہ وفاقی کم از کم اجرت 7.25 ڈالر فی گھنٹہ ہے۔ نیویارک اور سان فرانسسکو جیسے شہروں میں بلند کرایوں کی وجہ سے محنت کشوں کا رہنا بہت دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ سب سے بڑے شہر نیویارک میں گزشتہ آٹھ برسوں میں کرایوں میں اوسطاً 12 فیصد اضافہ ہوا جبکہ آمدن محض 2 فیصد بڑھی ہے۔ نیویارک، شکاگو اور زیادہ بڑے شہروں میں آدھے سے زیادہ خاندان اپنی آمدن کا تیس فیصد سے زیادہ کرائے میں ادا کرنے پر مجبور ہیں۔

تمام بڑے شہروں میں رہائش نسلی طور پر منقسم ہے اور نسلی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والوں کے علاقے زبوں حالی کا شکار ہیں۔ فلاڈلفیا، بالٹی مور، شکاگو اور دوسرے بڑے شہروں کے اندرونی علاقے بے روزگاری، جرائم، تشدد اور منشیات کا گڑھ بن چکے ہیں۔ ان علاقوں میں تعلیم، صحت کی سہولیات اور دیگر انفراسٹرکچر غیر معیاری ہیں۔ یہاں بسنے والوں کی اکثریت سیاہ فام یا لاطینی

امریکہ سے تعلق رکھتی ہے۔ 2015ء میں آتشیں اسلحے سے قتل ہونے والوں کی تعداد 13,286 تھی۔ اس تشدد میں زخمی اور اپاہج ہو جانے والے افراد کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ 2015ء ہی میں ماس شوٹنگ (سر عام فائرنگ سے بڑے پیمانے پر قتل) کے 372 واقعات ہوئے جن میں 475 قتل اور 1870 افراد زخمی ہوئے۔ فنانشل ٹائمز کے مطابق امریکی میں گولی سے مرنے کے امکانات پاکستان میں دہشت گردی سے مرنے سے زیادہ ہیں۔ تشدد کے یہ واقعات سماج میں موجود ایک گہری نفرت اور مایوسی کی علامتیں ہیں۔ اس سے کہیں تشویش ناک سالانہ 42,000 کے قریب خودکشیاں ہیں۔ پولیس کے مظالم کا جائزہ لینے والے ادارے کے مطابق 2015ء میں پولیس کے ہاتھوں 1207 افراد قتل ہوئے۔ سماج پر طاری یاس کی تازہ ترین مثال ہیروئن کی وبا ہے۔ 2014ء میں منشیات اور نشہ آور ادویات کے استعمال سے 47,055 افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ ہر روز 78 افراد ہیروئن اور اس جیسی نشہ آور ادویات کے ہاتھوں ہلاک ہو رہے ہیں۔ ان کی بڑی تعداد درمیانے طبقے کے متمول افراد پر مشتمل ہے۔

سماج میں عدم مساوات جہاں طبقاتی ہے وہاں یہ سماج نسلی بنیادوں پر بھی تقسیم ہے۔ حکمران طبقہ 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کا کلاسیکی داؤ استعمال کر کے اپنی بالادستی قائم رکھے ہوئے ہے۔ نسلی اقلیتوں میں غربت، بے روزگاری، جرائم اور تشدد کہیں زیادہ ہیں۔ فورز میگزین کے مطابق ایک عام سیاہ فام خاندان کے پاس ایک اوسط سفید فام خاندان کے مقابلے میں 6 فیصد دولت ہے جبکہ لاطینی خاندان کے پاس 8 فیصد۔ ایک سفید فام مرد کی ایک ڈالر اجرت کے مقابلے میں اسی کام کے ایک سفید فام عورت کو 79 سینٹ، ایک لاطینی عورت کو 55 سینٹ اور ایک سیاہ فام عورت کو 60 سینٹ ملتے ہیں۔ امریکہ کی جیلوں میں 23 لاکھ افراد قید ہیں۔ یہ تعداد چین اور ہندوستان میں قیدیوں کی تعداد کو ملا کر بھی زیادہ ہے۔ ان میں 37 فیصد سیاہ فام اور 33 فیصد لاطینی ہیں جبکہ آبادی میں ان کا تناسب 13 اور 17 فیصد ہے۔ اس وقت جتنے سیاہ فام مرد کالج میں ہیں اس سے زیادہ تعداد جیلوں میں قید ہے۔ امریکہ دنیا کے صرف تین ایسے ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہے جہاں زچگی کے دوران تنخواہ کے ساتھ چھٹی کا قانون نہیں ہے۔ اسی طرح ملازمین کو ملنے والی چھٹیوں میں بھی امریکہ صنعتی ممالک میں سب سے نیچے ہے۔

سیاست

جہاں سماج میں یاس اور بیزاری کی علامات بڑھ رہی ہیں وہیں سماجی خلفشار کا اظہار وقتاً فوقتاً تحریکوں کی صورت میں بھی ہو رہا ہے۔ 2006ء میں تارکین وطن کی تحریک میں کروڑوں محنت شریک تھے۔ معاشی کریش کے بعد 2011ء کی آکوپائی وال سٹریٹ اور میڈیسن کی تحاریک نوجوانوں اور محنت کشوں کے غصے کی ایک جھلک تھیں۔ سیاہ فام افراد کے پولیس ہاتھوں قتل اور تشدد کے خلاف 'بلیک لائیوز میٹر' (Black Lives Matter) اور کم از کم اجرت 15 ڈالر کرنے کے لیے 'فائٹ فار 15' کی تحریکیں اگرچہ خودرو ہیں اور ان میں مرکزیت نہیں لیکن یہ سماج میں سلگتے ہوئے عدم اطمینان کی علامات ضرور ہیں۔

سماج میں جاری عدم اطمینان کا اظہار سیاسی میدان میں واضح ہے۔ امریکی سیاست تقریباً ایک صدی سے، اور بالخصوص دوسری عالمی جنگ کے بعد دو پارٹی سسٹم کے گرد گھوم رہی ہے۔ ری پبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹیاں سیاسی جماعتوں سے زیادہ الیکشن مشینری ہیں اور ریاست کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ دائیں بازو کی دونوں پارٹیوں میں شاید اتنا ہی فرق ہے جتنا پیپسی اور کوکا کولا کے مشروبات میں۔ سیاست اور سرمائے کا تال میل ایسا ہے کہ انتخابات میں اربوں ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں۔ فیڈرل الیکشن کمیشن کے مطابق ایوان زیریں (ہاؤس آف ریپریزنٹیٹوز) کی سیٹ جیتنے کے لیے اوسطاً 1.7 ملین ڈالر خرچ کرنے پڑتے ہیں اور سینٹ کی سیٹ 10.5 ملین ڈالر خرچ کرنے پر جیتی جاتی ہے۔ اس دو پارٹی نظام نے سرمایہ دارانہ نظام کو بہت عرصے تک سہارا دیا لیکن کوئی اور متبادل نہ ہونے کی وجہ سے اب یہی پارٹیاں شدید دباؤ کا شکار ہیں۔

2008ء کے کریش کے بعد سماجی خلفشار کو پھٹنے سے روکنے کے لیے حکمران طبقے نے اوباما اور اس کے مبہم 'تبدیلی' کے نعرے کو پروان چڑھایا۔ پہلے سیاہ فام صدر اور درمیانے طبقے کا پس منظر رکھنے کی وجہ سے سماج کے کچھ حصوں نے اسے ایک تبدیلی کے طور پر دیکھا۔ لیکن یہ سراب جلد ہی ٹوٹ گیا جس کے بعد کسی حد تک ایک سیاسی جمود دیکھنے میں آیا۔ لیکن 2016ء کے صدارتی انتخابات سماجی شعور میں ایک اہم موڑ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان حالات میں برنی سینڈرز کا

منظرعام پرآنا اوراسے ملنے والی پذیرائی ایک نئی پیش رفت ہیں۔

سینڈرز کی زیادہ تر سیاست ایک آزاد امیدوار کے طور پر رہی ہے لیکن مختلف ایشوز پر وہ ڈیمو کریٹک پارٹی کے ساتھ ووٹ دیتا رہا ہے۔صرف آٹھ برس قبل اوباما کے مخالفین اسے سوشلسٹ کہہ کر گالی دیتے تھے لیکن برنی سینڈرز کی ساری مہم 'جمہوری سوشلزم' کے گرد رہی ہے۔ یہ ایک بڑی تبدیلی ہے۔ کچھ عرصے سے جاری رائے عامہ کے جائزوں کے مطابق نوجوان سرمایہ داری سے زیادہ سوشلزم کے حق میں ہیں۔ برنی سینڈرز کی مجوزہ پالیسیوں میں مفت صحت کا نظام، کالج کے دو سال تعلیم مفت اور کم از کم اجرت 15 ڈالر شامل تھے۔ اگرچہ یہ سرمایہ دارانہ اصلاح پسندی سے زیادہ کچھ نہیں لیکن امریکی سماج اور سیاست کے تناظر میں بہت ریڈیکل تصور کیے جا رہے ہیں۔ وال سٹریٹ کو لگام ڈالنے اور 'ارب پتی طبقے' کے خلاف 'سیاسی انقلاب' کے نعرے نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئے۔ ملک بھر میں اس نے ہزاروں کے جلسے کیے۔ ہیلری کلنٹن کی منافقت اور اس کی وال سٹریٹ اور اسٹیبلشمنٹ سے قربت کے مقابلے میں برنی سینڈرز ایک مخلص اور بے باک سیاست دان کے طور پر سامنے آیا تھا۔ تاہم اس کا پروگرام سرمایہ داری میں اصلاح پسندی کا پروگرام تھا اور سکینڈینویا (سویڈن، ڈنمارک وغیرہ) کے ماڈل سے متاثر تھا۔ لیکن سکینڈینویا اور دوسرے یورپی ممالک میں بورژوا فلاحی ریاست دوسری عالمی جنگ کے بعد سرمایہ داری کے عروج کے دور میں قائم ہوئی تھی جو اب بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ سرمایہ داری کے زوال اور بحران کے دور میں نظام اور ریاست کے پاس اس طرح کے اقدامات کرنے کی گنجائش بہت کم ہے۔

برنی سینڈرز کی تمام تر مقبولیت کے باوجود ڈیموکریٹک پارٹی کے ڈیلی گیٹس کے جوڑ توڑ اور پارٹی اسٹیبلشمنٹ کی بھرپور کوششوں سے ہیلری کلنٹن ڈیموکریٹک پارٹی کی صدارتی امیدوار نامزد ہو چکی ہے۔ برنی سینڈرز کی جانب سے اسے تسلیم کرنے اور اپنے ہی کاز سے غداری کرنے کے بعد اس سے حامیوں میں ایک وقتی مایوسی ضرور ہے۔ لیکن اس سے ڈیموکریٹک پارٹی کے بارے میں خوش فہمیاں اور جھوٹی امیدیں بھی ٹوٹی ہیں اور یہ امریکہ کے محنت کشوں اور نوجوانوں کے لیے ایک اہم سبق ہے۔ برنی کے گرد بننے والی تحریک کی سماجی و سیاسی بنیادیں بدستور موجود ہیں اور مزید شدت اختیار کر رہی ہیں۔ محنت کشوں کی ایک عوامی پارٹی کی جانب سفر میں یہ اسباق اہم

کردار ادا کریں گے۔

سماج میں ہونے والی پولرآئزیشن بائیں اور دائیں دونوں جانب اپنا اظہار کرتی ہے۔ دائیں بازو کے پاپولسٹ ڈونلڈ ٹرمپ کا ابھار بورژوا سیاست اور ری پبلکن پارٹی کے بحران کا عکاس ہے۔ یہ ارب پتی پراپرٹی ڈیلر بورژوازی کا سنجیدہ نمائندہ نہیں ہے۔ اس نے خود کو اسٹیبلشمنٹ مخالف امید وار کے طور پر پیش کیا ہے کیونکہ عوام کی اکثریت موجودہ حکمران اسٹیبلشمنٹ سے بیزار ہیں۔ اس کے حامیوں کی اکثریت قصباتی علاقوں میں سماج کی پسماندہ پرتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ درمیانے طبقے کی نچلی پرتیں ہیں جو معاشی بحران سے بری طرح متاثر ہوئی ہیں۔ بحران سے پہلے بھی ایک طویل عرصے سے سرمائے کے شہری علاقوں میں ارتکاز کا عمل جاری تھا جس سے یہ پرتیں غربت اور بے روزگاری میں گرتی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ محنت کش طبقے کے کچھ حصے بھی اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کا تعلق ان صنعتوں سے ہے جو مسلسل زوال پذیر ہیں اور ماضی کی خوشحالی کی جانب لوٹ جانے کا خواب (جس کا نعرہ ٹرمپ لگا رہا ہے) ان کے لیے دلکش ہے۔ یہاں تک کہ اس نے فتح یاب ہونے پر ری پبلکن پارٹی کو محنت کشوں کی پارٹی بنانے کا اعلان کیا ہے۔ لیکن اس کی زیادہ تر نعرہ بازی نسل پرستی، خواتین، ہم جنس پرستوں، معذوروں اور تارکین وطن کے خلاف نفرت پر مبنی ہے۔ وہ لوگوں کے خوف اور عدم تحفظ کے احساس سے کھیل کر عظمت رفتہ کی واپسی کا پیغام دے رہا ہے جو سماج کی کچھ پرتوں کے لیے بلاشبہ پرکشش ہے۔ لیکن اس کے خلاف ردعمل بھی شدید ہے۔ متعدد مقامات پر اس کے جلسوں کے خلاف مظاہرے پرتشدد شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ شکاگو میں تو اس کے جلسے کو ہونے ہی نہیں دیا گیا۔ ری پبلکن پارٹی کی اسٹیبلشمنٹ پہلے تو اسے ایک مذاق سمجھ رہی تھی۔ لیکن اس کی مہم کی تیزی کے بعد انہوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی جو بے سود ثابت ہوئی۔ اب وہ پارٹی کا نامزد امیدوار ہے اور پارٹی اسٹیبلشمنٹ اسے کی نامزدگی روکنے میں ناکام رہی ہے۔ ری پبلکن پارٹی پہلے ہی بحران سے دوچار ہے اور گزشتہ برس اپنی ہی پارٹی کے ایوان زیریں کے سپیکر جان بونر کو فارغ کرنا اس بحران کا ایک اظہار ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کا ابھار ری پبلکن پارٹی میں دراڑیں ڈال رہا ہے اور کئی نامور ریپبلیکن ہیلری کلنٹن کی حمایت کا اعلان کر رہے ہیں۔ پارٹی کے دو سابقہ صدور بش سینیئر اور جونیئر، نامزدگی کی دوڑ میں ٹرمپ کا مدمقابل ٹیڈ کروز

اور کئی دوسرے اس کی حمایت میں سامنے نہیں آئے۔

امریکی بورژوازی کے سنجیدہ حلقے ٹرمپ جیسے ناقابل اعتماد شخص کو اقتدار نہیں دینا چاہتے۔ ان کی پسندیدہ امیدوار ہیلری کلنٹن ہے۔ یہ خاندان چالیس برس سے کسی نہ کسی صورت میں اقتدار میں ہے اور حکمران طبقے کے لیے آزمودہ اور قابل اعتماد ہے۔ وہ اسے پہلی خاتون صدر بنا کر اوباما والا فارمولا دہرانا چاہتے ہیں۔ لیکن اب حالات 2008ء والے نہیں ہیں اور نوجوان عورتوں کی اکثریت برنی سینڈرز کی حمایت کر رہی تھی۔ ہیلری کی زیادہ تر مہم لوگوں کو ٹرمپ سے ڈرا کر ووٹ حاصل کرنے پر مبنی ہے۔ کم تر برائی کا یہ فلسفہ ایک لمبے عرصے سے امریکی سیاست پر حاوی ہے۔ لیکن اب اس کی حدود پوری ہو چکی ہیں اور موجودہ انتخابی مہم ایک نئے سیاسی دور کا آغاز ہے۔ سرمایہ داری پر عدم اعتماد اس کے اداروں، سیاست اور ریاست پر عدم اعتماد کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن ہیلری کلنٹن اگر صدر بنتی ہے تو وہ جس معاشی، سماجی، ریاستی اور سفارتی بحران کا سامنا کرنے پر مجبور ہوگی اس میں اسے جارحانہ رجعتی پالیسیاں اپنانا پڑیں گی۔ خارجی میدان میں وہ افغانستان، عراق اور دوسرے علاقوں میں دوبارہ فوجی جارحیت کی جانب بڑھے گی جبکہ داخلی طور پر سرمایہ داری کے بحران کے تقاضوں کے مطابق وال سٹریٹ کی حمایت اور محنت کشوں پر مزید ریاستی اور اقتصادی جبر کی مرتکب ہوگی۔

امریکہ میں اس وقت ٹریڈ یونینز کی رکنیت تاریخی طور پر کم ترین سطح پر ہے۔ محنت کشوں کا 11.1 فیصد یونینز میں منظم ہے۔ 1950ء کی دہائی میں یہ شرح 35 فیصد کے قریب تھی۔ سرمایہ داری کے عروج کے دنوں میں یونین قیادتیں سرمایہ داروں اور ریاست کے ساتھ مل کر محنت کشوں کو قابو میں رکھنے کا کام انجام دیا کرتی تھیں۔ معیشت اور صنعت کے بحران اور زوال کے اس عہد میں بھی یونین قیادت یہی فریضہ انجام دینے کی کوشش میں ہے، جس سے محنت کشوں کی بڑی تعداد قیادت سے بدظن ہے۔ یونین قیادت سیاسی طور پر ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ منسلک ہے۔ ہڑتالوں کی تعداد تاریخی طور پر کم ترین سطح پر ہے۔ 2015ء میں ایک ہزار سے زیادہ محنت کشوں کی شمولیت والی صرف 12 ہڑتالیں ہوئیں جن میں 47 ہزار محنت کش شریک تھے۔ لیبر تحریک کے عروج کے دنوں میں مثلاً 1974ء میں 424 ایسی ہڑتالیں ہوئی تھیں جن میں سترہ لاکھ محنت

کشوں نے حصہ لیا تھا۔اس وقت محنت کشوں کے غم و غصے کا اظہار صنعتی میدان کی بجائے سیاسی میدان میں ہو رہا ہے۔ یہ محض اس عمل کی شروعات ہے اور پرولتاری طبقہ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بہت سے اسباق اخذ کرے گا۔ سیاسی میدان میں سیکھے گئے اسباق یونینز اور مزدور تحریک پر اثر انداز ہوں گے۔

ان حالات میں سب سے زیادہ نوجوان متاثر ہو رہے ہیں۔ موجودہ نسل تاریخ کی سب سے تعلیم یافتہ نسل ہے۔اعلیٰ تعلیمی ڈگریوں کے باوجود اس نسل کے حالات پچھلی سے بہتر ہونے کی بجائے ابتر ہیں۔ نوجوانوں میں بے روزگاری کی سرکاری شرح اوسط سے دگنی ہے۔ 32 فیصد نوجوان اپنے والدین کے گھروں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ 1960ء میں یہی شرح 20 فیصد تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے انہیں مستقبل سے زیادہ امید نہیں ہے۔ان کی بڑی تعداد اس نظام سے باہر کسی حل کی تلاش کی جانب سوچنا شروع ہو چکی ہے۔ یہ نسل ماضی کے تعصّبات کو مسترد کرتے ہوئے ایک حقیقی تبدیلی کی جانب دیکھ رہی ہے۔ سماج میں بائیں بازو کی جانب ایک عمومی رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔ ریڈیکلائزیشن کے ساتھ پولرائزیشن بھی بڑھ رہی ہے۔ طبقاتی جنگ کی ابتدائی صف آرائی ہمارے سامنے ہے۔ یہ ایک طویل عمل ہے جو کئی مراحل سے گزرے گا۔لیکن ایک بات حتمی ہے کہ اب سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے طویل مدت کا سیاسی استحکام قائم نہیں ہو سکے گا۔مختلف نئے سیاسی رجحانات کا عروج و زوال ہوگا۔ امریکی خواب یعنی سرمایہ داری میں رہتے ہوئے معیار زندگی میں مسلسل اضافے کی امید ماضی کا قصہ بن چکی ہے۔اب امریکہ کے محنت کش اور نوجوان ایک حقیقی تبدیلی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔امریکی محنت کشوں کے ہاتھ میں دیوہیکل طاقت ہے۔ یہ طبقہ ساری دنیا کو بدل کر رکھ سکتا ہے اور عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔

کینیڈا

8 سال ہونے کو ہیں مگر کینیڈین معیشت 2008ء کے بحران سے پہلے والی سطح پر بھی نہ آ پائی بلکہ اندرونی و بیرونی تضادات کی وجہ سے کسی بھی وقت یہ دوبارہ معاشی بحران میں گھر سکتی ہے۔ فی الوقت معیشت تکنیکی طور پر تقریباً Recession میں ہے یا اس جانب بڑھ رہی ہے۔ 2015ء میں معاشی نمو کی شرح پچھلے سال (2014ء) سے نصف ہو کر صرف 1.18 فیصد رہی۔ زراعت کے شعبے میں خام داخلی پیداوار 2013ء میں 29 بلین (ارب) ڈالر تھی جو مئی 2016ء میں سکڑ کر 26 بلین ڈالر پر آ گئی۔ معدنیات کے شعبے میں خام داخلی پیداوار اکتوبر 2014ء میں 142 بلین ڈالر سے گر کر اب 121 بلین ڈالر پر آ گئی ہے۔ پیداواری شعبے کی خام داخلی پیداوار جو 2006ء میں 199 بلین ڈالر تھی مئی 2016ء میں 171 بلین ڈالر کی سطح پر ہے۔

1991ء میں بینک آف کینیڈا کی شرح سود قریباً 16 فیصد تھی جو گرتے گرتے 2008ء کے بحران سے قبل 4.5 فیصد پر آ گئی۔ بحران سے بچنے کے لیے 2008ء اور 2009ء کی درمیانی مدت میں اس شرح سود کو 9 بار گرایا گیا۔ 2009ء اور 2010ء کے دوران تو یہ 0.25 فیصد کر دی گئی۔ مگر شرح سود کو اس خطرناک حد پر رکھنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس سے جڑی بچتوں پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ جیسے 2010ء میں حکمرانوں کو لگا کہ بحران ٹل گیا ہے وہ شرح سود کو تین دفعہ بڑھاتے ہوئے 1 فیصد تک لے آئے۔ مگر فوراً ہی اس کے منفی اثرات سے معیشت پھر لڑکھڑانے لگی اور وہ ایک فیصد شرح سود محض پانچ سال ہی رکھ پائے۔ 2015ء سے اب تک بینک آف کینیڈا کو شرح سود دو مرتبہ گرانی پڑی۔ تاحال یہ 0.5 فیصد پر ہی ہے۔ مگر منڈیاں پہلے ہی اضافی پیداوار سے اٹی پڑی ہیں تو سرمایہ دار کم شرح سود پر بھی سرمایہ کاری سے کترا رہے ہیں۔

دوسری جانب چینی معیشت میں گراوٹ کی وجہ سے خام تیل کی طلب میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔ اس نے کینیڈین معیشت کو ہلا کر رکھ دیا۔ البرٹا کے Tarsand تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ مگر Tarsand سے حاصل ہونے والا خام تیل لاگت میں روایتی طریقوں سے حاصل شدہ تیل سے زیادہ جبکہ معیار میں اس سے کم ہوتا ہے۔ یوں ریفائنری میں اس کے اچھے

دام نہیں ملتے۔ چونکہ اس نظام میں تیل کی پیداوار ضرورت کی تکمیل کے بجائے منافع کے حصول کے لیے کی جاتی ہے اس لیے جب Tarsand سے خام تیل منافع بخش نہیں رہا تو تیل نکالنے والی کمپنیوں نے یہاں سے راہِ فرار اختیار کی۔ محض ایک سال کے عرصے میں البرٹا کے صوبے میں 70,000 کل وقتی محنت کش روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ صوبائی انتخابات مئی 2015ء میں عوام نے ایک عرصے سے راج کرتی کنزرویٹو حکومت کو تیسرے نمبر پر دھکیل دیا اور پہلی بار البرٹا میں NDP کو صوبائی حکومت ملی۔ لبرل یہاں اپنی پانچ میں چار نشستیں ہار بیٹھے۔ جبکہ کنزرویٹو کا گڑھ مانے جانے والے صوبے میں خود کنزرویٹو اپنی 70 میں سے 60 سیٹیں گنوا بیٹھے۔ NDP کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی سوشلسٹ اساس کی جانب لوٹتی اور کم از کم فرار ہوتی ہوئی تیل کی کمپنیوں کو اشتراکی ملکیت میں قومیا لیا جاتا۔ مگر اس نے صوبائی حکومت میں ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہ کیا۔ مئی 2015ء کے صوبائی الیکشن سے اکتوبر 2015ء تک البرٹا کی عوام نے لگ بھگ 6 ماہ NDP کو پرکھا مگر کوئی ٹھوس تبدیلی کے آثار نظر نہ آنے پر اسی عوام نے وفاقی انتخابات میں NDP کو آئینہ دکھا دیا اور کنزرویٹو امیدوار بھاری اکثریت سے دوبارہ میدان مار گئے۔ ان چند سالوں کی مدت میں محنت کشوں نے بارہا یہ باور کروا دیا ہے کہ وہ اصلاح پسندی کو رد کر چکے ہیں اور بہت بڑی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ ایک طرف تو تیل کی گرتی قیمتوں نے حکمرانوں کے ایوان ہلا دیے دوسری جانب عالمی منڈی میں کینیڈین مصنوعات کی طلب میں کمی سے زر کی عالمی منڈی میں کینیڈین ڈالر کی مانگ میں خاطر خواہ کمی ہوگئی۔ اس کے باعث عالمی زر کی منڈی میں ایک امریکی ڈالر کے مقابلے کینیڈین ڈالر محض 76 سینٹ کا رہ گیا۔ 1970ء سے 2008ء تک غیر ملکی تجارت کا توازن ہمیشہ ہی کینیڈا کے حق میں رہا۔ اس کے بعد سے یہ زیادہ تر منفی ہے۔ جون 2016ء میں یہ تجارتی خسارہ تاریخ کی بدترین سطح 3.63 بلین ڈالر تک آ گیا۔ کینیڈین صنعتیں اپنی پیداواری صلاحیت کا محض 80 فیصد ہی استعمال کر رہی ہیں۔ قرضوں کا عفریت تو بالکل ہی قابو سے باہر ہے۔ نجی قرضے GDP کا 250 فیصد ہو چکے ہیں۔ بیرونی اور داخلی قرضہ جات 2015ء میں 612 بلین ڈالر ہو گئے۔ 2007ء میں حکومتی قرضہ جات GDP کا 66.5 فیصد تھے جو 2015ء تک GDP کا 91.5 فیصد ہو گئے ہیں۔ صرف مئی 2016ء کے ایک ماہ کے

دوران مزید 250 کمپنیاں دیوالیہ ہوگئیں۔ معیشت کا ہر شعبہ گراوٹ کا شکار ہے۔ نہیں گرا تو بس کارپوریٹ منافع، جو 2015ء کی آخری سہ ماہی میں 47.6 بلین ڈالر تھے اور 2016ء کی پہلی سہ ماہی میں بڑھ کر 61.7 بلین ڈالر ہو گئے۔ کم شرح سود اور Deficit Financing مختصر دورانیے کے لیے تو معیشت کو بچائے ہوئے ہیں مگر ان کی وجہ سے معیشت میں ایک اور بحران پک رہا ہے۔ بچتوں کی حوصلہ شکنی ہو رہی ہے۔ بجٹ خسارے کا سارا بوجھ آخر کار محنت کشوں پر ہی لادا جائے گا۔ ماضی قریب کی مونٹریال میں ہونے والی ہڑتالیں اور ٹورانٹو میں ہونے والے یونیورسٹی طلبہ کے احتجاج حکمران طبقے اور اشرافیہ کے لیے تنبیہہ ہیں۔ محنت کشوں کو مصنوعی مسائل میں زیادہ تر الجھائے رکھنا ممکن نہیں ہے۔ ان میں جڑت پیدا ہوگی اور یہ مقامی احتجاج اور ہڑتالیں مقامی نہیں رہیں گی بلکہ ان کا دائرہ پورے ملک میں پھیلے گا۔ کینیڈین محنت کشوں کا ان حکمرانوں اور اس نظام سے اعتبار اٹھتا جا رہا ہے۔

گرتی ہوئی کمزور معیشت نے سماج کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اپریل 2016ء میں 7 فیصد محنت کش روزگار سے محروم تھے جبکہ نوجوانوں میں بے روزگاری کا تناسب 13.3 فیصد تھا۔ کینیڈا پنشن پلان پر بوجھ پڑا تو محنت کشوں کی قربانی دے دی گئی اور ریٹائرمنٹ کی عمر 60 سے بڑھا کر 65 سال کر دی گئی۔ دوسری جانب کل وقتی ملازمتوں کو باقاعدہ سسٹم کے تحت جز وقتی ملازمتوں سے بدلا جا رہا ہے۔ محض جولائی 2016ء میں 71,400 کل وقتی محنت کشوں کو بے روزگار کیا گیا۔ جبکہ اسی ایک ماہ میں 40,200 جز وقتی ملازمتیں دی گئیں۔ صارفین کے قرضہ جات (Consumer Credit) اب 552.8 بلین ڈالر پہنچ گئے ہیں۔ گھریلو قرضہ (Household Debt) بھی GDP کا 97.6 فیصد ہو گیا ہے جو آمدنی کا 167 فیصد ہے۔ 2015ء کی ایک رپورٹ کے مطابق 36 کینیڈین یونیورسٹیز کے 18,000 گریجویٹس پر اوسطاً 26,819 ڈالر تعلیمی اخراجات کی مد میں قرضہ ہے اور ان کی اکثریت کم از کم آمدنی کی سطح سے زرا اوپر ہی کما پاتی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ٹورانٹو کے باسی اپنی آمدنی کا نصف محض رہائشی کرایہ کی مد میں ادا کرتے ہیں۔

نیو ڈیموکریٹک پارٹی (NDP) 1961ء میں 'کینیڈین لیبر کانگریس' اور بائیں بازو کی

سوشلسٹ جماعت 'کوآپریٹو کامن ویلتھ فیڈریشن' (CCF) کے ضم ہونے سے وجود میں آئی۔NDP کے بنیادی منشور Regina Manifesto میں اس اولین ترجیح کا عزم کیا گیا تھا کہ سرمایہ داری نظام کو اکھاڑ پھینکا جائے گا اور اس کی جگہ منصوبہ بند سوشلسٹ معیشت و جمہوریت لائی جائے گی۔حالیہ انتخابات میں اپنی انتخابی مہم کے آغاز میں اس نے عوام کے دکھوں پر مرہم رکھی۔کم از کم اجرت 15 ڈالر فی گھنٹہ کرنے کا نعرہ لگایا گیا۔بچوں کے لیے Day Care کے اخراجات میں کمی کا وعدہ ہوا۔کینیڈا بھر میں 200 نئے طبی مراکز قائم کرنے کا کہا گیا۔ صوبوں کو 7000 ڈاکٹر اور میڈیکل سٹاف بھرتی کرنے کے لیے درکار فنڈز کا وعدہ کیا۔بزرگ شہریوں کی دیکھ بھال کی استطاعت میں مزید 41000 افراد کی دیکھ بھال کی گنجائش نکالنے کا وعدہ ہوا۔بچوں کی نگہداشت کے لیے Day Care سینٹرز کی صلاحیت میں دس لاکھ کا اضافہ کرنے کا عندیہ دیا جن کے زیادہ سے زیادہ فیس 15 ڈالر روزانہ ہوگی۔عوام نے NDP کے بیانات دیکھتے ہوئے اسے سر آنکھوں پر بٹھالیا۔ایک وقت ایسا آیا کہ سروے رپورٹس کے مطابق NDP کی مقبولیت کا گراف 37 سے 40 فیصد کے درمیان آ گیا۔جبکہ کنزرویٹو 30 اور لبرلز 24 فیصد پر تھے۔مگر NDP قیادت میں ایک ٹھوس سوشلسٹ پروگرام کا فقدان تھا۔سروے نتائج کے نشے میں دھت پارٹی قیادت نے دائیں جانب جھکنا شروع کر دیا اور Bay Street (کارپوریٹ سرمائے کے مراکز کی سڑک) کے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا شروع کر دی گئی۔جیسے جیسے NDP دائیں جانب جھکتی گئی لبرلز ویسے ویسے بائیں جانب مڑتے گئے۔الیکشن نتائج آئے تو لبرلز کینیڈا بھر میں میدان مار گئے۔محنت کش عوام نے عوامی رائے کو نظر انداز کرنے پر NDP کو کڑی سزا دی۔

الیکشن 2015 کے دوران لبرل پارٹی نے جو وعدے کیے تھے وہ محض ان کی سیاسی چال تھی جو بازی جتا گئی۔کنزرویٹوز پر شدید نکتہ چینی کرنے والے لبرلز آج خود اسی راستے پر گامزن ہیں۔ پچھلی حکومت نے ڈاک کی گھر گھر ترسیل بند کر دی تھی۔وعدے کے باوجود اسے اب تک بحال نہیں کرایا جا سکا۔امریکی سامراج کی خوشنودی کی خاطر جب کینیڈا نے داعش کے خلاف جنگی مہم جوئی کا آغاز کیا تو لبرلز نے خوب مگرمچھ کے آنسو بہائے کہ اس مہم جوئی سے ناحق لوگوں کا خون ہو رہا ہے۔

مگر آج لبرل سرکار نے نہ صرف یہ کہ یہ مہم جوئی جاری رکھے ہوئے ہے بلکہ اس کی معیاد میں توسیع کر دی گئی۔ F-35 طیاروں کی خریداری کے سودے پر خوب برہمی کا اظہار کیا گیا کہ اتنے مہنگے جہاز خریدنے کی کیا ضرورت ہے، مگر وہ سودے تا حال برقرار ہیں۔ جب حکومت میں نہیں تھے تو انسانی حقوق کے نعرے لگاتے نہیں تھکتے تھے۔ مگر آج سعودی حکومت کو انسانی حقوق کی پامالی کے باوجود جنگی ساز و سامان بیچا جا رہا ہے۔ کینیڈا کی ریاست کروڑوں شامیوں کو گھر بدر کرنے پر مجبور کر کے آج چند ہزار تارکین کو پناہ دے کر اپنے کارنامے اور نیکی کی خوب تشہیر کر رہی ہے۔

لبرلز کے نعرے بائیں بازو کے اور ان کے عمل دائیں بازو کے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ دن اپنا مکروہ چہرہ چھپا نہ پائیں گے۔ لبرلز کے ہنی مون کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ حالات کے ستائے مزدوروں اور نوجوانوں کا صبر ختم ہونے کو ہے۔ حال ہی میں ٹورانٹو سے متصل شہر مسی ساگا کے لائبریری ورکرز نے مجبور ہو کر ہڑتال کر دی۔ یہ ان کی تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ میں پہلی ہڑتال تھی۔ دوسری جانب کینیڈا پوسٹ اور لیبر یونین CUPW کے مابین 2011ء سے چلے آ رہے تنازعات مزید شدت اختیار کر گئے ہیں۔ یونین کنٹریکٹ کی جو پیشکش مینجمنٹ نے کی ہے وہ کسی صورت یونین کو قبول نہیں اور پوسٹل ورکرز نے اسے یکسر مسترد کرتے ہوئے ہڑتال کے حق میں فیصلہ سنا دیا ہے۔ مینجمنٹ کی جانب سے دھمکیاں دی جا رہی ہیں لیکن لبرل سرکار سارے معاملے میں چپ سادھے ہوئے ہے۔ عوام میں بے چینی اور اضطراب کی کیفیت ہار پر کے چلے جانے سے کچھ دیر کو ماند پڑ گئی تھی۔ مگر ان کے کرب کا کارن کوئی ایک شخص یا گروہ یا سیاسی جماعت نہیں بلکہ وہ معاشی نظام ہے جو جونک کی مانند ان کا خون چوس کر زندہ ہے اور جب تک یہ نظام باقی ہے یہ اضطراب بار بار امڈ آئے گا اور ہر بار اس کی شدت میں اضافہ ہوگا۔

معاشی حالات کی وجہ سے خاندان ٹوٹ کر بکھر رہا ہے۔ یہ معاشی جبر نفسیاتی بیماریوں اور گھریلو تشدد کی شکل میں اپنا اظہار کر رہا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق یہاں 25 کی عمر تک کے 20 فیصد نوجوان کسی نہ کسی قسم کی نفسیاتی بیماری کا شکار ہیں۔ مئی 2016ء میں جاری کی گئی CBC کی رپورٹ کے مطابق گھریلو تشدد کی ایسی وارداتیں جن میں اسلحہ استعمال ہوا میں 70 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اونٹاریو میں ہائی سکول کے آخری سال کے 83 فیصد بچے شراب نوشی

کرتے ہیں۔ یادرہے کہ یہاں 19 سال کی عمر سے پہلے شراب نوشی کی ممانعت ہے۔ 23 فیصد بچوں کو منشیات کی پیشکش ہوئی۔ جبکہ 17 فیصد بچے غیر قانونی طریقے سے حاصل کی گئی ادویات کا نشہ کرتے ہیں۔ CSIS کی رپورٹ کے مطابق کینیڈا میں منظم جرائم کے 950 سے زیادہ گروہ سرگرم ہیں۔ جن میں 80 فیصد کی آمدنی کا ذریعہ منشیات کا دھندہ ہے۔ منشیات کے عادی افراد کا 60 فیصد حصہ 15 سے 24 سال کی عمر کا ہے۔ صرف British Columbia کے صوبہ میں بھنگ کی کاشت سے 5 سے 7 بلین ڈالرز کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ نوجوانوں میں بھنگ کے بڑھتے رجحان کو دیکھ کر حکومت نے اپنی الیکشن مہم میں بھنگ کی خرید وفروخت کو قانونی شکل دینے کا وعدہ کیا تھا اور نوجوانوں کے خوب ووٹ بٹورے۔

کینیڈا میں طبقاتی تضاد تیزی سے شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔ ایک طرف معاشی تنگدستی کی وجہ سے محنت کشوں اور نوجوانوں میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے۔ دوسری جانب ان کے بنیادی حقوق پر پے در پے مجرمانہ حملے کیے جارہے ہیں۔ مستقل ملازمتوں کو ختم کر کے کنٹریکٹ پر بھرتیاں کی جارہی ہیں۔ کل وقتی محنت کشوں کو فارغ کر کے جز وقتی اور عارضی بھرتیاں کی جارہی ہیں۔ لے دے کے مفت صحت اور مفت ہائی سکول کی تعلیم رہ گئی تھی، اس پر بھی لالچی سرمایہ دار گدھ جھپٹنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ ایک منظم سازش کے تحت مفت علاج نشانے پر ہے۔ ایک معمولی X-Ray یا CT-Scan کے لیے اکثر ہفتوں اور مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ Specialist ڈاکٹروں سے تاریخ ملتے ملتے نو نو ماہ لگ جاتے ہیں۔ ایسے ہی حملے سکولوں، اساتذہ اور عملے پر بھی کئے جارہے ہیں۔ پچھلے سال اونٹاریو کے بورڈز کے اساتذہ ہڑتال پر گئے جس سے 67,000 بچے متاثر ہوئے۔ ریاستی جبر سے تو خود ریاستی جبر کے مسلح جتھے بھی محفوظ نہیں۔ 2013ء میں حالات سے تنگ آ کر ایڈمنٹن میں جیل کا حفاظتی عملہ ہڑتال پر چلا گیا۔ الٹا تین ہڑتالی محافظوں کو نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ دسمبر 2015ء میں اونٹاریو کی جیلوں کے حفاظتی عملے نے بھی ہڑتال کی کال دے دی تھی۔

ان تنازعات کو جتنا دبانے کی کوشش کی جارہی ہے وہ اتنے ہی شدید اور ناحل پذیر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دوجے سے برسرپیکار دونوں طبقات میں مصالحت کی تمام کوششیں عارضی ثابت

ہوئی ہیں اور کچھ عرصہ بعد یہ تضادات ایک نئی شدت سے دوبارہ ابھر جاتے ہیں۔ یہ طبقاتی جنگ پہلے ہی معرکہ میں جیتنا شاید ممکن نہ ہو۔ مگر محنت کش طبقہ اس لڑائی کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ اگر وہ اکا دکا معرکے ہار بھی گیا تو کیا غم۔ اس کے پاس کھونے کو بچا ہی کیا ہے سوائے زنجیروں کے۔ لیکن آخری معرکے میں محنت کشوں کی فتح یقینی ہے۔

لاطینی امریکہ

اس صدی کا آغاز لاطینی امریکہ میں سوشلزم کی نئی اٹھان سے ہوا تھا۔ سویت یونین کے زوال کے بعد پہلی مرتبہ عالمی سطح پر سوشلزم کی صدا بلند ہوئی۔ وینزویلا میں ہوگوشاویز کے ابھار سے شروع ہونے والی یہ لہر لاطینی امریکہ کے تقریباً تمام ممالک تک پھیلی۔ اس عمل کے دوران بولیویا، نکاراگوا، ایکواڈور، برازیل، ارجنٹائن اور چلی تک میں بائیں بازو کے پاپولسٹ برسراقتدار آئے۔ لیکن 2015ء کے اختتام اور موجودہ سال کے آغاز میں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ بایاں بازو اپنی اصلاح پسندانہ پالیسیوں کے تحت اب انتہائی مشکلات کا شکار ہے۔

22 نومبر 2015ء کو ارجنٹائن میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں بائیں بازو کی سابق صدر کرسٹینا فرنانڈیز کی دائیں بازو کے میور شیو میسری کے ہاتھوں شکست کے فوراً بعد 6 دسمبر کو وینزویلا میں دائیں بازو (اپوزیشن) کی قانون ساز اسمبلی میں دو تہائی سے زیادہ نشستوں پر کامیابی ہوئی، اس کے بعد برازیل میں ڈیلما روزف کی زوال پزیری اور مواخذے کو دائیں بازو کے تجزیہ نگار 'اکیسویں صدی کے سوشلزم کی ناکامی' اور دائیں بازو کی برتری سے تعبیر کر رہے ہیں۔ ایکواڈور میں رافیل کورایا کی حکومت کے خلاف بھی دائیں بازو کی ایجی ٹیشن چل رہی ہیں جس کی وجہ سے رافیل کورایا نے تیسری مرتبہ انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کیا ہے۔ یہی کچھ بولیویا میں ہوا جہاں پر ایوو مورالس کو چوتھی مرتبہ صدراتی انتخابات میں حصہ لینے کی آئینی ترمیم کے ریفرنڈم میں شکست اٹھانی پڑی۔

ان بائیں بازو کی تقریباً تمام حکومتوں نے اپنے اقتدار میں معاشی اصلاحات کا آغاز کیا تھا جس کے دوران سامراجی اجارہ داریوں کی لوٹ مار پر کاری ضرب لگی اور کئی صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا گیا، کئی ایک جگہوں پر سامراجی قرضوں کی جزوی ضبطگی بھی کی گئی یا ایسی نعرہ بازی ہوئی۔ وینزویلا میں تیل کی صنعت میں نیشنلائزیشن ہوئی اور تعلیم، صحت اور رہائش کے دیوہیکل منصوبے شاویز دور میں شروع کئے گئے۔ بولیویا میں ایوو مورالس نے ریڈیکل اقدامات کے ذریعے بجلی کے ریٹ نصف اور لوڈشیڈنگ کا خاتمہ کیا، اسی طرح ایکواڈور میں رافیل کورایا نے سامراجی سودی

قرضوں کے گھن چکر کو چیلنج کیا۔ ان جرات مندانہ اقدامات کے اثرات دیگر ممالک مثلاً برازیل اور چلی کی سیاست پر بھی مرتب ہوئے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے انتہائی ریڈیکل اصلاحات کی بھی حدود ہوتی ہیں اور یہ اصلاحات جلد یا بدیر اپنی الٹ میں بدل جاتی ہیں۔

موجودہ سیاسی تبدیلیوں کا ٹھوس تجزیہ معاشی تبدیلیوں سے کیا جا سکتا ہے۔ 2008ء کے عالمی معاشی بحران کے گہرے منفی اثرات لاطینی امریکہ کی معیشتوں پر بھی پڑے ہیں۔ ان ممالک کی برآمدات میں اہم زرعی اجناس، خام مال اور تیل ہیں جس کا بڑا خریدار چین ہے۔ 2000ء سے لے کر 2011ء تک لاطینی امریکی کے ممالک اور چین کے مابین تجارت کا حجم 1 فیصد سے بڑھ کر 11 فیصد ہو گیا تھا، آج چلی، برازیل اور پیرو جیسے ممالک کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر چین بن چکا ہے۔ چین کی صنعتی سرگرمیوں کے ماند پڑ جانے سے خام مال کی طلب میں خاطر خواہ کمی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں تیزی سے کمی آئی ہے۔ چین میں طلب میں کمی کی وجہ سے خطے میں معاشی شرح نمو میں 2013ء سے مسلسل کمی آ رہی ہے، الٹا مندرجہ بالا کئی ممالک کی معیشتیں اب بڑھنے کی بجائے سکڑ رہی ہیں۔ وینزویلا، برازیل اور ایکوا ڈور وغیرہ تیل برآمد کرنے والے ملک ہیں اور تیل کی قیمت میں گراوٹ ان ممالک کی معیشتوں کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ تیل کی بلند قیمت کے وقت تو اصلاحات اور عوام کو کچھ دینے کی گنجائش موجود تھی لیکن اب یہ عمل اپنے الٹ میں بدل چکا ہے۔ افراط زر میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے جبکہ معاشی سرگرمیوں کے ماند پڑنے سے بیروزگاری میں اضافہ نظر آ رہا ہے۔ آئی ایم ایف نے اپنی تازہ رپورٹ میں لاطینی امریکہ کی مجموعی معیشت میں 0.3 فیصد کمی کی پیش گوئی کی ہے جبکہ اس سے پہلے 0.5 فیصد گروتھ کا کہا گیا تھا۔ 2015ء میں خطے کی اہم اور بڑی معیشت برازیل 3.8 فیصد سکڑی ہے اور یہ عمل مزید تیز ہونے کی پیش گوئی کی جا رہی ہے۔ وینزویلا کی معیشت بھی 2015ء میں 5.7 فیصد سکڑی ہے۔

'انٹر امریکن ڈویلپمنٹ بینک' کی رپورٹ کے مطابق وسطی امریکہ کے ممالک کی برآمدات میں پچھلے سال 14 فیصد کمی ریکارڈ کی گئی جبکہ جنوبی امریکہ کے ممالک کی مجموعی برآمدات میں 21 فیصد کمی ہوئی۔ 2015ء اس طرح کی کمی کا مسلسل تیسرا سال تھا جس میں خطے کے تمام ممالک کی

معیشت میں تنزلی دیکھی گئی۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک میں عالمی معاشی بحران کے زیادہ برے اثرات مرتب ہوئے ہیں، اسی رپورٹ کے مطابق وینزویلا میں 49 فیصد اور کولمبیا میں 35 فیصد کی شرح سے برآمدات میں کمی آئی ہے۔ چین میں خام لوہے کی طلب میں کان کنی سے وابستہ کمپنیوں کی توقعات سے زیادہ گراوٹ ہوئی۔ دنیا میں خام لوہے کی صنعت کی ترقی کے لئے 4.5 ٹریلین ڈالر کے قرضے دیئے گئے، اس میں برازیل میں انفراسٹرکچر اور بندرگاہوں کی تعمیر پر خاطر خواہ رقم خرچ کی گئی لیکن عالمی بحران کے باعث تمام عوامل اب گراوٹ کی طرف لے جارہے ہیں۔

خطے کی سب سے بڑی معیشت برازیل کی کیفیت سے پورے خطے کی معاشی صورتحال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آئی ایم ایف کے مطابق 2016ء میں برازیل کی معیشت کی شرح نمو صرف ایک فیصد تک رہنے کا امکان ہے جبکہ افراط زر میں 10 فیصد تک اضافہ ہوگیا ہے، تاہم قوی امکانات یہی ہیں کہ 2016ء میں معیشت مزید سکڑے گی اور نمو نہیں ہوگی۔ رواں برس 9.3 ارب ڈالر کے بانڈ ہولڈرز کو قرضوں کی واپسی کی صورت میں ارجنٹائن کی معیشت جزوی طور پر دیوالیہ ہوچکی ہے۔ ملک میں بڑے پیمانے پر کٹوتیاں اور برطرفیاں کی گئی ہیں اور محنت کشوں پر شدید حملے کئے جارہے ہیں۔ اس کے خلاف عوام نے احتجاج بھی کئے ہیں، ان احتجاجوں کی وجہ سے ملک کے صدر مارشی نے مقامی سرمایہ داروں کے ساتھ 90 دن تک کوئی برطرفی نہ کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق 2016ء میں ارجنٹائن کی معیشت 0.8 فیصد مزید سکڑے گی۔

وینزویلا میں افراط زر 500 فیصد تک پہنچ چکا ہے جس کی وجہ تیل کی قیمتوں میں کمی کے ساتھ ساتھ مقامی سرمایہ داروں کی ذخیرہ اندوزی بھی ہے، بجلی کے بحران پر قابو پانے کے لئے سرکاری دفاتر میں ہفتہ وار اوقات کار پانچ دن کی بجائے دو دن کردیئے گئے ہیں۔ GDP سکڑ رہا ہے جبکہ صنعتی پیداوار 5.4 فیصد کی شرح سے گر رہی ہے۔ پیرو کی معیشت اگرچہ ابھی سکڑاؤ سے دو چار نہیں ہے لیکن شرح نمو مسلسل کم ہورہی ہے اور 2011ء میں 6.5 فیصد سے کم ہوکر 2015ء میں 3.3 فیصد پر آچکی ہے، منفی 1.7 فیصد صنعتی ترقی کی شرح ہے یعنی گراوٹ ہے اور برآمدات میں 13.4 فیصد کمی ریکارڈ کی گئی ہے۔ پیرو کے کل GDP میں 60 فیصد حصہ سروس سیکٹر کا ہے

جس میں ٹیلی کام اور فنانس سروسز شامل ہیں۔ چلی کی برآمدات میں ''اضافے'' کی شرح منفی 16.9، بولیویا منفی 32.5، میکسیکو منفی 4.1 اور کولمبیا منفی 34.9 فیصد ہے (2015ء کے اعداد و شمار) یعنی ہر جگہ برآمدات سکڑ رہی ہیں۔

معدنی ذخائر اور قدرتی دولت سے مالا مال لاطینی امریکہ سامراج اور سرمایہ داری کے جبر میں محرومی اور غربت کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ ہسپانوی (سپین) سامراج سے امریکہ سامراج تک ہر سامراجی قوت نے اس خطے کو تاراج کیا ہے اور یہاں اندھی لوٹ مار کی ہے۔ اس سلسلے میں اہم ان ممالک کی بالکنائزیشن تھی جس میں سامراج کے ایما پر مقامی بورژوازی نے اپنی لوٹ مار کے لئے اس خطے کے ٹکڑے کئے۔ مقامی جاگیرداروں، ابھرتی ہوئی بورژوازی اور چرچ نے شروع سے ہی سامراج کی تابعداری میں یہاں کی نسلوں کو غلامی کی اندھی کھائیوں میں دھکیل دیا۔ ٹراٹسکی نے اپنے نظریہ 'انقلاب مسلسل' میں واضح کیا تھا کہ سابقہ نوآبادیاتی ممالک تاریخ کے میدان میں تاخیر سے داخل ہوئے ہیں۔ ان ممالک میں بورژوازی کسی قسم کا ترقی پسند کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا قومی جمہوری انقلاب کے نامکمل فرائض بھی محنت کشوں پر عائد ہوتے ہیں جو آج کے عہد میں صرف سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ادا کئے جا سکتے ہیں۔

وینزویلا

وینزویلا میں گزشتہ تقریباً ڈیڑھ دہائی سے چلی آ رہی انقلاب اور ردانقلاب کی کشمکش ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ بائیں بازو کی پارٹی PSUV (یونائیٹڈ سوشلسٹ پارٹی آف وینزویلا) سے تعلق رکھنے والے صدر نکولس مادورو نے 14 مئی کو بڑے عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے وینزویلا کی معیشت کو سبوتاژ کرنے میں مصروف سامراجی کمپنیوں اور مقامی سرمایہ داروں پر بڑا وار کرنے کا اعلان کیا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں ان فیکٹریوں کو ضبط (نیشنلائز) کرنے اور ان کے مالکان کو جیل بھیجنے کی دھمکی دی ہے جنہوں نے اپنی پیداوار مختلف حیلے بہانوں سے بند کر رکھی ہے۔ دارالحکومت کاراکاس میں اپنے حامیوں سے خطاب کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ ''معاشی بحران سے نکلنے کے لئے ملک میں پیداواری صلاحیت کو بحال کرنا ہوگا''۔ انہوں

نے مزید کہا کہ ''ہمیں پیداواری صلاحیت حاصل کرنے کے لئے تمام اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جسے سرمایہ داروں نے مفلوج کر رکھا ہے۔ جو بھی ملک کو نقصان پہچانے کے لئے پیداوار روکنا چاہتا ہے اسے لازمی باہر نکالا جائے گا اور ہتھکڑی پہنائی جائے گی اور ملک کی مرکزی جیل میں بھیج دیا جائے گا... ہم سامراج اور دائیں بازو کے بین الاقوامی طبقے کو بتانا چاہتے ہیں کہ یہاں لوگ اپنے کھیتوں کے ساتھ حاضر ہیں اور اپنے وطن کے دفاع کے لئے ان کے ایک ہاتھ میں آلات اور دوسرے ہاتھ میں ہتھیار ہیں''۔ یہ اعلان انہوں نے خوراک اور مشروبات تیار کرنے والی ملک کی سب سے بڑی کمپنی 'پولر گروپ' کی جانب سے پیداوار روکنے کے عمل کے بعد کیا ہے۔ اس کمپنی کا مالک ارب پتی سرمایہ دار 'لوریز ومنڈوزا' PSUV کا سخت مخالف تھا۔

اس سے ایک دن قبل انہوں نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی تھی جو کہ 2017ء تک جاری رہنے کے امکانات ہیں۔ صدر مادورو کا کہنا تھا کہ ملک میں مسائل کا باعث بننے والی غیر ملکی معاشی جارحیت کو روکنے کے لئے ہنگامی اقدامات ضروری ہیں۔ نکولس مادورو، وینزویلا کے سامراج اور سرمایہ داری مخالف رہنما اور 1999ء سے 2013ء تک ملک کے صدر رہنے والے ہوگو شاویز کے نائب کی حیثیت سے ان کے انتقال کے بعد ملک کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

ہوگو شاویز نے برسر اقتدار آنے کے بعد ''21ویں صدی کے سوشلزم'' کا نعرہ بلند کر کے سامراجی لوٹ مار کو لگام دی تھی، تیل کی صنعت کو نیشنلائز کر کے اس کا منافع عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کرنے کا آغاز کیا تھا، تعلیم، صحت اور رہائش کی سہولیات میں بہتری کے دیوہیکل منصوبے شروع کئے تھے اور عالمی سطح پر امریکی سامراج کی قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اسرائیل کی صیہونی جارحیت کے خلاف ٹھوس اور جرات مندانہ موقف اختیار کرنے کی وجہ سے بھی انہیں دنیا بھر کے محنت کشوں اور نوجوانوں میں پذیرائی ملی تھی۔ اس تناظر میں PSUV کی حکومت روز اول سے ہی امریکی و ہسپانوی سامراج (وینزویلا سپین کی کالونی رہا ہے) اور سرمایہ داروں کے لئے ناقابل قبول رہی ہے اور وہ دائیں بازو کی اپوزیشن اور دوسرے داخلی و بیرونی حربوں کے ذریعے سے اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش میں مسلسل مصروف رہے۔

واضح رہے کہ وینزویلا تیل برآمد کرنے والا نواں بڑا ملک ہے اور تیل کی قیمتوں میں مسلسل

کمی کے باعث اس کی معیشت کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ افراط زر کے پیش نظر عام ضرورت کی اشیا کی قیمت مسلسل بڑھ رہی ہے اور عوام کو شدید مشکلات کا سامنا ہے۔

وینزویلا میں انقلاب اور ردانقلاب کی یہ کشمکش 1999ء میں ہوگو شاویز کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے ہی مختلف شکلوں میں جاری ہے۔ شاویز جب پہلی بار الیکشن جیتا تھا وہ خود کو ''ریڈیکل ڈیموکریٹ'' کہلانا پسند کرتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام کے اندر ہی کرپشن کے خاتمے اور عوام کے حق میں اصلاحات کی کوشش کی۔ اسے جلد ہی اندازہ ہونے لگا کہ سرمایہ داری کو ''جائز'' طریقے سے چلانے کے راستے میں سب بڑی رکاوٹ سامراجی ملٹی نیشنل کمپنیاں اور مقامی سرمایہ دار خود تھے جن کے منافعوں کے لئے بدعنوانی، جبر و استحصال اور لوٹ مار لازمی شرائط ہیں۔ تاہم اس وقت شاویز کے سطحی اقدامات بھی ان کے مفادات پر ضرب لگا رہے تھے چنانچہ امریکی سامراج نے کچھ فوجی جرنیلوں کے ذریعے اپریل 2002ء میں ایک 'کُو' کے ذریعے اس کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اقتدار کے اس قلیل عرصے میں بھی شاویز کی مقبولیت محنت کشوں اور غریب عوام میں بہت بڑھ چکی تھی۔ عوام اس سازش کو مسترد کرتے ہوئے مشتعل ہو کر لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے، فوج کے جونیئر افسران اور سپاہیوں کی ہمدردیاں بھی شاویز کے ساتھ تھیں، چنانچہ اس تحریک کے ذریعے امریکی سامراج اور سرمایہ داروں کے کٹھ پتلی جرنیلوں کو گرفتار کر لیا گیا اور 72 گھنٹوں میں ہی شاویز واپس اقتدار میں آ چکا تھا۔

یہاں سے انقلاب کے ایک نئے ریلے کا ابھار ہوا۔ شاویز نے ''21ویں صدی کا سوشلزم'' کا نعرہ لگایا، بڑے پیمانے پر نیشنلائزیشن کی اور عوام دوست معاشی و سماجی اقدامات کا آغاز کیا۔ خارجی سطح پر اس نے ہر فورم پر سامراجی جبر و استعمار کے خلاف آواز بلند کی اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے جارج ڈبلیو بش کو شیطان تک قرار دیا۔ سامراجیوں اور مقامی سرمایہ داروں پر مبنی ردانقلابی قوتوں نے شاویز حکومت کے خلاف تخریب کاری مسلسل جاری رکھی۔

مسئلہ یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے سے جاری انقلابی تحریک یا صورتحال کے باوجود وینزویلا کا انقلاب ادھورا ہے اور آج بھی دوراہے پر کھڑا ہے۔ وینزویلا کا موجودہ معاشی بحران درحقیقت شاویز کے دور میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ وہاں سرمایہ داری کے خلاف اقدامات تو کئے گئے ہیں لیکن

اس کا یکسر خاتمہ نہیں کیا گیا جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ PSUV کوئی 'مارکسسٹ لینن اسٹ' پارٹی ہے نہ ہی سوشلسٹ انقلاب کو آخری مرحلے تک مکمل کرنے کا نظریاتی ادراک شاویز کے پاس تھا۔ سرمایہ دارانہ معیشت اور ریاست کا یکسر خاتمہ نہ ہونے کی وجہ سے انقلاب مسلسل عروج و زوال کا شکار رہا ہے۔ عوام نے 7 مرتبہ شاویز اور PSUV کو مختلف قسم کے انتخابات میں فتح مند کیا لیکن پارٹی قیادت کے زیادہ تر مشیر اور پالیسی ساز خود کو ''سوشلسٹ'' قرار دینے کے باوجود زیادہ سے زیادہ بائیں بازو کے اصلاح پسند ہیں۔ وینزویلا کی مثال ثابت کرتی ہے کہ تیل کی وسیع دولت کے باوجود بھی سرمایہ دارانہ نظام میں مستقل اور پیہم بنیادوں پر مراعات عوام کو نہیں دی جا سکتی۔ اب جبکہ تیل کی قیمتیں گراوٹ کا شکار ہیں تو صورتحال ابتر ہو چکی ہے۔

شاویز کا جانشین اور موجودہ صدر نکولس مادورو محنت کش طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور ایک بس ڈرائیور تھا لیکن اس کی پالیسی بھی سرمایہ داری میں ہی اصلاحات تک محدود رہی ہے۔ وہ ایک ایسے وقت میں اقتدار میں آیا ہے جب سرمایہ داری عالمی سطح پر شدید بحران سے دوچار ہے۔ PSUV کو 2015ء کے پارلیمانی انتخابات میں پہلے ہی شکست ہو چکی ہے اور اب سامراج اور سرمایہ داروں کی گماشتہ اپوزیشن اسے صدارت سے بھی فارغ کرنا چاہتی ہے۔

مادورو کے حالیہ ہنگامی اقدامات ثابت کرتے ہیں کہ سرمایہ داری کو اصلاحات کے ذریعے ''ٹھیک'' نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تمام تر نعرے بازی اور سرمایہ داروں کو سزائیں دینے اعادوں کے باوجود مادورو ہچکچاہٹ اور تذبذب کا بھی شکار ہے۔ اس نے شاید اتنی دیر کر دی ہے کہ اب اس میں کوئی جرات مندانہ اقدامات کرنے کی قوت ہی دم توڑ گئی ہے۔ جب تک سرمایہ داری موجود ہے سرمایہ دار موقع ملنے پر پلٹ کر وار کریں گے۔ مادورو نے بند فیکٹریوں کو نیشنلائز کرنے کا جو عندیہ دیا ہے اس کو پوری معیشت تک پھیلائے بغیر انقلاب مکمل نہیں ہو سکتا۔ بصورت دیگر رد انقلاب آئے گا اور اب تک جو مراعات بھی عوام کو حاصل ہوئی ہیں نہ صرف انہیں چھینے گا بلکہ جبر و استحصال اور وحشت کی انتہا کر دے گا۔ انقلاب کی طرح اس رد انقلاب کے اثرات بھی پورے لاطینی امریکہ اور دنیا پر مرتب ہوں گے۔

کیوبا

اپریل 2016ء میں امریکی صدر اوباما کے دورہ کیوبا کو تاریخی قرار دیا گیا۔ کارپوریٹ میڈیا اور سامراجی دانشور تاثر دے رہے تھے کہ ''سوشلزم کے آخری گڑھ'' میں سرمایہ داری کی بحالی کا آغاز ہو چکا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے شدید بحران کے اس عہد میں یہ پراپیگنڈ خصوصی طور پر کیا جا رہا ہے تا کہ دنیا بھر میں محنت کش اور نوجوان جس متبادل نظام کی جدوجہد کر رہے ہیں یا اس جانب راغب ہو رہے ہیں، اس رجحان کو سبوتاژ کیا جا سکے۔ تاہم کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

یہ 1928ء کے بعد کسی برسر اقتدار امریکی صدر کا پہلا دورہ کیوبا تھا۔ اوباما اور راؤل کاسترو (فیڈل کاسترو کا چھوٹا بھائی) کے درمیان مذاکرات کے نتیجے میں 2014ء میں دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات کی بحالی کا آغاز ہوا تھا۔ دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات انقلابِ کیوبا کے کچھ عرصے بعد 1961ء میں منقطع ہوئے تھے۔ فیڈل کاسترو اور چے گویرا کی قیادت میں برپا ہونے والے اس انقلاب کے ذریعے کیوبا میں سے امریکی سامراج کے کٹھ پتلی جنرل بیٹسٹا کی آمریت کو اکھاڑا گیا تھا۔ کیوبا پر امریکہ کی جانب سے سخت معاشی پابندیاں اسی وقت سے عائد ہیں اور کیوبن حکومت کے مطابق گزشتہ تقریباً پانچ دہائیوں کے دوران کیوبا کو 1100 ارب ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

کیوبا میں انقلاب کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کیا گیا اور اس وقت کے سوویت یونین کی طرز پر ہی سہی لیکن منصوبہ بند معیشت نافذ کی گئی۔ آج بھی بڑی حد تک کیوبا کا طرز معیشت یہی ہے جسے امریکی سامراج اب ''سافٹ وار'' کی حکمت عملی سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ کیوبا سے ''مذاکرات'' کا آغاز اور اوباما کا تین روزہ دورہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ راؤل کاسترو کیوبا کے سیاسی نظام میں تبدیلی کے بغیر امریکہ کے ساتھ معمول کے سفارتی تعلقات کی بحالی اور معاشی پابندیوں کا خاتمہ چاہتا ہے۔ کیوبن حکومت اپنے جزائر پر سے امریکی قبضہ بھی ختم کروانا چاہتی ہے جن میں سے ایک پر گوانتاناموکی بدنام زمانہ جیل قائم ہے۔ اوباما کیوبا پر سے معاشی پابندیاں اٹھانے پر رضامند نظر آتا ہے لیکن ری پبلکن پارٹی کی اکثریت پر مبنی امریکی کانگریس اس پر تیار

نہیں۔اس لحاظ سے اوباما کے دورے میں علامتی ''خیر سگالی'' کے علاوہ کیوبا کے لئے کچھ نہیں تھا۔

کیوبن ریاست کا ایک دھڑا ''چینی ماڈل'' کی طرز پر سرمایہ داری کی ''محدود'' بحالی چاہتا ہے۔اوباما اسی دھڑے کے ذریعے واردات کرنا چاہتا ہے۔ایسی کوئی پالیسی حتمی طور پر سرمایہ داری کی مکمل بحالی پر منتج ہوگی اور تعلیم، علاج اور روزگار سمیت منصوبہ بند معیشت کی تمام حاصلات رفتہ رفتہ ضائع ہو جائیں گی۔تاہم ریاست اور کمیونسٹ پارٹی میں ابھی بھی مضبوط دھڑے موجود ہیں جو منصوبہ بند معیشت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

کیوبا میں سرمایہ داری کی بحالی کے لئے امریکی سامراج کی ''سافٹ وار'' پالیسی کی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ نام نہاد ''چینی ماڈل'' کے نتائج آج سب کے سامنے ہیں اور چینی معیشت تیزی سے زوال پذیر ہے۔ایسے میں ''چینی ماڈل'' سے وابستہ بہت سی خوش فہمیاں دور ہو رہی ہیں۔آخری تجزیئے میں کیوبا کے محنت کشوں اور نوجوانوں کی مزاحمت اور عالمی سطح پر انقلابی تحریکوں کی کامیابی ہی انقلابِ کیوبا کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔

آسٹریلیا

ملک کی پارلیمانی تاریخ میں 1987ء کے بعد پہلی مرتبہ اور مجموعی طور پر ساتویں مرتبہ 02 جولائی کو ڈبل ڈسولوشن (Dissolution) کے انتخابات کروائے گئے۔ نتائج کے مطابق دائیں بازو کی لبرل کولیشن 74 سیٹوں کے ساتھ پہلے جبکہ بائیں بازو کی لیبر پارٹی 66 سیٹوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہی۔ ڈبل ڈسولوشن سے مراد دونوں منتخب ایوانوں، ایوان نمائندگان اور ایوان بالا (سینیٹ) کے درمیان پیدا شدہ سیاسی تعطل کی وجہ سے ان کو ایک ساتھ تحلیل کیا جانا ہے۔ منتخب وزیر اعظم کی تحریری تجویز اور روبرو ملاقات کے بعد ملک میں موجود تاج برطانیہ کا نمائندہ گورنر جنرل دونوں ایوانوں کے نئے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کرتا ہے جس میں ایوان نمائندگان کے 150 اور سینیٹ کے 76 ممبران کا براہ راست انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے۔ آئینی طور پر ملک میں ہر تین سال کے بعد انتخابات کرائے جاتے ہیں جس میں ایوان نمائندگان کی تمام سیٹوں اور سینیٹ کی آدھے سیٹوں پر انتخابات ہوتے ہیں۔ صرف ڈبل ڈسولوشن کی صورت میں دونوں ایوانوں کے تمام ممبران کے چناؤ کے لیے انتخابات کروائے جاتے ہیں۔

اس الیکشن میں آزاد امیدواروں سے لے کر درجنوں چھوٹی بڑی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی مقابلہ دو بڑی پارٹیوں آسٹریلین لیبر پارٹی اور لبرل کولیشن (لبرل پارٹی آف آسٹریلیا، لبرل نیشنل پارٹی آف کوئینز لینڈ، کنٹری لبرلز اور نیشنل پارٹی آف آسٹریلیا) کے درمیان ہوتا ہے۔ 2013ء کے انتخابات میں لبرل کولیشن نے لیبر پارٹی، جو 2007ء سے حکومت کر رہی تھی، کو شکست دے کر اقتدار سنبھالا تھا۔ ان دونوں بڑی پارٹیوں کے علاوہ آسٹریلین گرین پارٹی تیسری بڑی پارٹی ہے جس کا ایوان زیریں میں اب تک صرف ایک ہی ممبر 2010ء کے انتخابات سے منتخب ہوتا آرہا ہے لیکن ایوان بالا (سینیٹ) میں گزشتہ کئی سالوں سے گرین پارٹی کے سینیٹرز کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا ہے جس کی حالیہ تحلیل سے پہلے ان کے دس ممبران تھے۔

ڈبل ڈسولوشن انتخابات کی بنیادی وجہ سینیٹ میں حکمران لبرل کولیشن کے پاس اکثریت کا نہ ہونا تھا جس کی وجہ سے حکمران جماعت کو اپنی مرضی کے قوانین بنانے میں کافی مشکلات درپیش

رہیں۔ اس کی ایک مثال حکومت کے صنعتی تعلقات کا بل تھا، جو تعمیراتی صنعت سے وابستہ یونین کے محنت کشوں اور نمائندوں کے اختیارات کم کرنے کا بل تھا جسے آسٹریلین لیبر اور گرین پارٹی اور آزاد سینیٹرز نے اگست 2015ء اور اپریل 2016ء میں مسترد کر کے ناکام بنا دیا۔ سینیٹ میں یہی حکومتی ناکامی ڈبل ڈسولوشن انتخابات کا باعث بنی۔ اگرچہ حکومت اسے ایک سیاسی ڈیڈ لاک قرار دیتی رہی لیکن درحقیقت یہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے نامیاتی بحران ہی کا نتیجہ ہے جس نے پوری دنیا میں سیاسی پارٹیوں اور حکومتوں کو سیاسی بحرانوں اور سماج کو معاشی زوال پذیری کی شکل میں دبوچ رکھا ہے۔

آسٹریلیا میں اکتوبر 2009ء سے ستمبر 2015ء تک کے چھ سالوں میں چار وزرائے اعظم اور تین اپوزیشن لیڈر تبدیل ہوئے۔ ملکی تاریخ میں اتنی مختصر مدت میں لیڈروں کی اس تعداد میں تبدیلی کی مثال نہیں ملتی۔ ملکی سیاسی منظر نامے میں بڑھتی ہوئی عدم اعتمادی کی یہ فضا دراصل عالمی سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے گہرے ہوتے ہوئے بحران کی غمازی کرتی ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے سرمایہ دارانہ جمہوری ممالک میں برسر اقتدار پارٹیاں اور حکومتیں ایک طرف نیولبرل اکانومی کی عوام دشمن پالیسیاں لاگو کرنے کی پابند ہیں اور دوسری طرف ان کی عوام دشمن پالیسیوں کے ردعمل میں حکومتوں اور پارٹیوں پر عوامی نفرت اور بیزاری کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ سیاسی بے یقینی اور بھونچال اس تناؤ اور کشمکش کا نتیجہ ہیں۔

2008ء کے عالمی اقتصادی بحران سے اگرچہ آسٹریلیا کی معیشت امریکہ اور یورپی ممالک کی طرح متاثر نہیں ہوئی تھی لیکن ملکی اقتصاد اور معیشت پر اس بحران کے اچھے خاصے اثرات پڑے تھے جس کا اندازہ ملک کے بجٹ خسارے میں اچانک اضافے سے لگایا جا سکتا ہے۔ 2007ء تک آسٹریلیا کا کل حکومتی قرضہ 60 اَرب ڈالر سے کم تھا اور کئی سالوں سے سالانہ بجٹ سرپلس چل رہا تھا۔ 2009ء کے مالی سال میں کل حکومتی قرضہ 100 اَرب ڈالر سے تجاوز کر گیا۔ اس دوران اس وقت کی لیبر حکومت نے کیون روڈ کی قیادت میں معیشت میں استحکام لانے کے لیے اکتوبر 2008ء اور فروری 2009ء میں پچاس ارب ڈالر سے زائد کے اقتصادی پیکج دیئے جن کے تحت پنشنرز، ایک مخصوص سطح تک آمدنی رکھنے والے افراد اور ان کے سکول جانے والے بچوں کو امدادی

رقوم کی مد میں کئی سو ڈالر دیئے گئے۔ تاہم 2008-09ء کے بعد حکومتی بجٹ خسارے میں تاحال ہر سال مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیبر پارٹی اور لبرل کولیشن نے بجٹ سرپلس کے انتخابی وعدوں کے بعد اب اس بات کا اقرار کیا ہے کہ 2020-21ء سے پہلے بجٹ کو سرپلس میں نہیں لایا جاسکے گا یعنی آئندہ چار سالوں میں بھی بجٹ خسارہ جاری رہے گا۔ آسٹریلیا کا بجٹ خسارہ اس وقت جی ڈی پی کے 3 فیصد کے آس پاس منڈلا رہا ہے۔ دونوں بڑی پارٹیوں کا بجٹ کو سرپلس کرنے کے لیے موثر اقدامات کا وعدہ اس الیکشن کا ایک اہم موضوع اور نعرہ بن گیا تھا۔

امریکہ، چین، جرمنی، جاپان جیسے بڑے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت آسٹریلیا کی معیشت اور منڈی چھوٹی ہے۔ چین اور دوسرے ایشیائی ممالک جیسے جاپان، جنوبی کوریا اور انڈیا وغیرہ آسٹریلیا کے اہم ترین تجارتی پارٹنرز ہیں۔ 2008ء کے معاشی بحران سے پہلے چینی معیشت کی تیز رفتار ترقی اور اس کے نتیجے میں آسٹریلیا کی معدنیات کی برآمدات سے ہونے والی آمدنی تاریخی طور پر بلند ترین سطح پر پہنچ گئی تھی۔ معدنیات، زرعی اجناس اور لائیوسٹاک ملکی برآمدات کے سب سے اہم ترین شعبے رہے ہیں۔ ان اشیا کا زیادہ تر حصہ چین، جاپان، جنوبی کوریا، انڈیا اور دوسرے ایشیائی ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے۔ کیون روڈ کی قیادت میں لیبر پارٹی نے ریاستی سرمایہ کاری (کینشین ازم) کی پالیسی اپناتے ہوئے اقتصادی پیکجوں کے ذریعے معیشت کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

اگرچہ چین اور آسٹریلیا کی معیشتیں اس عالمی بحران سے فوری طور پر محفوظ رہیں لیکن بعد کے آنے والے سالوں میں سرمایہ داری کے وجود سے جنم لینے والے اقتصادی بحران نے پوری دنیا کی معیشتوں کی طرح ان دونوں ممالک کو بھی آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آسٹریلیا کا ریاستی قرضہ جی ڈی پی کے 37 فیصد تک پہنچ گیا ہے، 2008ء میں یہ جی ڈی پی کا صرف 11 فیصد تھا۔ AFR کے 9 جون 2016ء کے شمارے میں سینیٹرنک زینوفون کے مطابق آسٹریلیا کے مجموعی بیرونی قرضوں کی سطح ایک ٹریلین ڈالر عبور کر گئی ہے۔ ABC ٹی وی کے پروگرام فورکارنر کے مطابق مئی 2016ء میں آسٹریلین بینکوں کی جانب سے جاری کیے جانے والے ہاؤسنگ کے قرضوں کی حد 1.5 ٹریلین ڈالر سے تجاوز کر گئی ہے۔ AFR کے مطابق صرف اپریل 2016ء میں 32 اَرب ڈالر کے ہاؤسنگ قرضے جاری کیے گئے۔

آسٹریلیا میں نسبتاً خوشحالی اور ترقی کے باوجود حکمران طبقات محنت کشوں پر معاشی حملوں کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ دائیں بازو کی لبرل کولیشن اس سلسلے میں بالخصوص عوام دشمن کردار ادا کرتی ہے۔ اب ایک بار پھر ان کی کوشش ہے کہ اسی انڈسٹریل ایکٹ (جو 2005ء سے لبرل پارٹی کے جان ہاورڈ دور میں نافذ کیا گیا تھا، جسے 2012ء میں لیبر پارٹی اور گرین پارٹی کے دور حکومت میں منسوخ کیا گیا تھا) کو پھر سے نافذ کیا جائے تا کہ مزدوروں کے مزید حقوق سلب کیے جائیں۔

آسٹریلیا میں سال 2015ء کے حکومتی بجٹ کا 60 فیصد (سالانہ تین سو اَرب ڈالر سے بھی زیادہ) حصہ سوشل سکیورٹی، مفت تعلیم، علاج اور صحت کے شعبوں پر مختص کیا گیا ہے۔ ملک کی تقریباً دو تہائی سے بھی زیادہ آبادی کسی نہ کسی طرح سوشل سکیورٹی پر انحصار کرتی ہیں اور ملک کی اسی فیصد سے بھی زیادہ آبادی سرکاری خرچے پر دی جانے والی تعلیم، علاج اور صحت کی سہولیات سے مستفید ہوتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے بحران کے پیش نظر اب حکمران عوامی فلاحی بہبود کے تمام شعبوں سے فنڈز کاٹنے کے اقدامات کر رہے ہیں اور انہیں سلسلہ وار انداز میں سالانہ بنیادوں پر کم کرنے کے منصوبوں پر گامزن ہیں۔

لبرل کولیشن حکومت اپنے مخصوص طبقاتی ایجنڈے کی بنیاد پر بڑے سرمایہ داروں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ٹیکس چھوٹ دینے اور محنت کشوں، کم آمدنی والے خاندانوں اور طالب علموں کے لیے مختص فلاح و بہبود کے حکومتی فنڈز میں کمی اور کٹوتیاں کرنے کے لیے ہر پل آمادہ اور تیار رہتی ہے۔ لیکن آسٹریلیا کے محنت کشوں اور نوجوانوں کی متوقع مزاحمت، جدوجہد اور عوامی فلاحی ریاست کی روایت اور سوچ رکھنے والے سماج میں یکدم اور اچانک بڑے پیمانے کی کٹوتیاں کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آسٹریلین لیبر پارٹی کا انتخابی پروگرام، حکومتی لبرل کولیشن کی نسبت زیادہ عوامی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آسٹریلین لیبر پارٹی سوشل ڈیموکریسی کی روایتی پارٹی ہونے کے ناطے طبقاتی مصالحت اور اصلاح پسندانہ پالیسیوں پر یقین رکھتی ہے اور ان پالیسیوں کی گنجائش سرمایہ داری کی ترقی یافتہ ترین شکلوں میں بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لیے حالیہ لبرل حکومت مزید کٹوتیاں کرے گی۔ اس کے علاوہ حکومتی سرپرستی میں چلنے والے باقی ماندہ اداروں کو جلد یا بدیر نجی ہاتھوں میں فروخت کرنے کی خواہش بھی لبرل کولیشن والے

دل میں چھپائے بیٹھے ہیں۔

برطانیہ کے ریفرنڈم میں یورپی یونین سے علیحدگی کو پڑنے والے ووٹ (Brexit) کے بعد آسٹریلیا میں بھی غیر یقینی صورتحال میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ سے ملکی اقتصادی صورتحال بھی سنگینی سے دوچار ہوسکتی ہے۔ جس طرح سے کہا جارہا ہے کہ ملک میں گزشتہ پچیس سالوں سے بغیر معاشی زوال کے ریکارڈ ترقی ہوتی رہی ہے لیکن اب اس ترقی کی رفتار کو مزید جاری رکھنا آسان نہیں ہے۔ ہاؤسنگ مارکیٹ کی بلند پرواز ختم ہورہی ہے۔ چین کی معیشت کی زوال پزیری کے بعد 'کانکنی کی صنعت کے عروج' (Boom Mining) کا دور گزر چکا ہے۔ مینوفیکچرنگ اور آٹو مینوفیکچرنگ کے شعبے میں ملازمتیں بڑی تعداد میں غائب ہوچکی ہیں۔ عالمی موسمیاتی تبدیلیوں کے نتیجے میں ملکی زراعت اور کئی علاقوں میں سیاحت کو خطرات لاحق ہیں۔ عالمی سطح پر معیشت کی سست روی اور چین کے سستے ترین سٹیل کے پیش نظر آسٹریلین سٹیل کی صنعت کا مستقبل غیر یقینی ہے اور اس کے ملازمین کے روزگار کو شدید مشکلات کا سامنا ہے۔

اس تمام صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے ملازمت، معاشی ترقی، روزگار کی ضمانت، تعلیم اور صحت کی ضمانت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ عالمی سطح پر ایک نئے معاشی بحران کی صورت میں حالات تیزی سے بگڑ سکتے ہیں۔ ایسے میں طبقاتی کشمکش ناگزیر طور پر شدید ہوگی۔